دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کا علمی و دینی مجلہ

ماہنامہ

الحق

زیر سرپرستی

شیخ الحدیث حضرۃ مولانا عبد الحق بانی و مہتمم دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک پشاور

مغربی پاکستان

بادِ صبا سے
جانِ صبا تک
بادِ صبا کے لطیف جھونکے، معصوم پھولوں کی
شگفتگی کا پیغام دیتے ہیں اور جانِ صبا کا
معطر جھاگ حسن کو نئی تازگی اور دلکشی بخشتا ہے
جانِ صبا ٹرانسپیرنٹ حسن افروز صابن
جمیل سوپ ورکس لمیٹڈ ـ کراچی ـ ڈھاکہ

لہٗ دعوۃ الحق

قرآن و سنت کی تعلیمات کا علمبردار

جلد : ۵
شمارہ : ۱۲

رجب ۱۳۹۰ھ
ستمبر ۱۹۷۰ء

ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک

مدیر ——————— سمیع الحق

اس شمارہ میں

★

بدل اشتراک

مغربی اور مشرقی پاکستان سے سالانہ ۸/ روپے فی پرچہ ۷۵ پیسے
غیر ممالک بحری ڈاک ——— سالانہ ایک پونڈ
غیر ممالک ہوائی ڈاک ——— سالانہ دو پونڈ

★

سمیع الحق استاد دارالعلوم حقانیہ طابع و ناشر نے منظور عام پریس پشاور سے چھپوا کر دفتر الحق دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک سے شائع کیا
برہتمام حاجی محمد حسین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ آغاز

جیسا کہ موجودہ حکومت کے واضح اور دوٹوک اعلانات سے ثابت ہو چکا ہے کہ آنے والے آئین ساز اسمبلی کے انتخابات کا اوّلین مقصد ملک کیلئے دستور تیار کرنا ہے دستور بھی ایسا جو نظریہ پاکستان اسلام کے تحفظ پر مبنی اور خالص اسلامی نظام کی ضمانت دیتا ہو اس مقصد کے حصول کا بے خطر راستہ تو ایک وہ ہے جسے ہم نے کئی ماہ قبل شرح و بسط سے انہی کالموں میں پیش کیا تھا کہ دستور سازی کا مسئلہ مختلف نظریات سے تشکیل پانے والی اسمبلی پر چھوڑنے کی بجائے صدر ضیاء صاحب جرأت مومنانہ سے کام لیکر ایک آرڈیننس کے ذریعہ ایسا دستور نافذ کر دیں جو خالص اسلامی دستور ہو۔ اسطرح ملک اُن خطرات سے نکل سکتا ہے جس میں وہ گھرا ہوا ہے اگر ون یونٹ کی تنسیخ بالغ رائے دہی اور مساوی نمائندگی کی بنیاد پر انتخابات کا فیصلہ غیر جمہوری نہیں بلکہ جمہوریت کی پاسداری ہے۔ تو جس ملک کے جمہور کی عظیم اکثریت اوّل دن سے لیکر اب تک اسلامی آئین اور اسلامی نظام حیات کیلئے تڑپ رہی ہو اُسے آرڈیننس کے ذریعہ اسلامی اور عوامی آئین مہیا کرنا ہرگز غیر جمہوری اقدام نہ ہوگا بلکہ وہ موجودہ حکومت کا ایک ایسا کارنامہ ہوگا جسے رہتی دنیا تک سراہا جائے گا۔

——— یہ صرف ہماری رائے نہیں بلکہ بہت سے رہنماؤں اور لیڈروں نے بھی اس قسم کا مطالبہ کیا، مگر اب جبکہ آئین سازی کا کام آئین ساز اسمبلی کو سپرد کیا گیا ہے تو اس مقصد کے حصول کی ایک ہی صورت نظر آتی ہے کہ اسمبلی میں ایسے علماء حق کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں بھیجا جائے جن کے علمی تبحر، دینی مقام، دیانت، تقویٰ اور اسوۂ سلف کی پیروی اور راسخ العقیدہ ہونے پر عامۃ المسلمین کا اعتماد ہو۔ اُن کا مشغلہ شب و روز قرآن و سنت اور اسلامی علوم کے درس و تدریس اور اشاعت و ترویج ہو اور جو غالب اکثریت میں اسمبلی پہنچ کر پاکستان کو ایک ایسا آئین دے سکیں جو تمام بیرونی اثرات سے پاک ہو اور قرآن و سنت آثار صحابہؓ و سلف پر مبنی ہو۔ ظاہر ہے کہ جب دنیا کے تمام معاملات کیلئے ہم متعلقہ امور ان ہی لوگوں کو سپرد کرتے ہیں جن میں اس کام کی اہلیت

تجربہ اور مہارت موجود ہو۔ میز کرسی بنوانے کے لئے بڑھئی، مشین کی خرابی کے لئے مستری اور انجنیئر کی تلاش کرتے ہیں۔ برٹش لاء کے لئے کسی ایل ایل بی ایڈوکیٹ کو اور اپریشن کے لئے ماہر سے ماہر سرجن کو دیکھتے ہیں، تو اسلامی اصولوں پر مبنی آئین کوئی ایسا مذاق نہیں جس کے لئے نہ تو کوئی اہلیت و صلاحیت ضروری ہو نہ اسلامی اور عربی علوم کی مہارت اور نہ ان اصولوں پر خود عمل پیرا ہونے کے معیار کا لحاظ لازمی ہو ہر وہ جماعت جو اسلام اسلام کا نعرہ پکارتی ہے مگر اسمبلی میں ایسے راسخ العقیدہ علماء حق کو غالب اکثریت میں بھیجنے کے لئے تیار نہیں ہوتی تو اُن کا نعرہ محض فریب اور حصولِ اقتدار کا ایک ذریعہ ہے ۔

آج مسلمانوں کے پاس تمام سیاسی جماعتوں کی اسلامیت جانچنے کی ایک ہی کسوٹی ہے۔ کہ جس اسلام کی وہ دن رات رٹ لگاتے ہیں۔ کیا اس کی خاطر وہ آئین سازی کے لئے خدا ترس متدین اور مسلمانوں کے قابلِ احترام علماء حق کو بھیجنے کے لئے تیار ہیں یا پھر وہ اپنی اسلام پسندی کے نعروں کے باوجود اپنی پارٹی، جتھہ اور گروہ بندی کی پوجا پاٹ کرتے ہوئے ایسے لوگوں کو نامزد کر رہے ہیں جنہیں اسلامی علوم کے ابجد سے بھی واقفیت نہیں نہ اُن کا عقیدہ اور ایمان اسلامی آئین کے اجراء پر راسخ ہے بلکہ اُن کا عمل بھی سر سے پاؤں تک اسلامی آئین سے بیزاری اور بغاوت کا کھلا اعلان کر رہا ہے۔ اگر ایسی ہی صورت سامنے آتی ہے تو ظاہر ہے کہ آئندہ اسمبلی میں بھی اسلام کا وہی حشر ہوگا جو اس سے پہلی اسمبلیوں میں ہوا اور نتیجہ میں وہ خلفشار اور سر پھٹول نمایاں ہوگا جس کا خمیازہ نہایت بھیانک شکل میں پوری قوم کو بھگتنا پڑے گا۔

★

الحمد للہ کہ اسلامی آئین کے مقصدِ عزیز کی خاطر ملک کے دونوں حصوں کے تقریباً ہر خطہ سے ممتاز، جید، خدا ترس علماء اکابر، وقت بزرگ اور مشائخ اپنی عزت اور آبرو، وسائل و اسباب کی فکر سے بے نیاز ہو کر الیکشن کے اس خارزار اور پُرخطر وادی میں کود پڑتے ہیں۔ اور مرکزی اسمبلی کے لئے الیکشن میں حصہ لے رہے ہیں۔ تاکہ اس طرح وہ اس امت پر اتمامِ حجت کر کے اللہ کی بارگاہ میں خود تو سرخرو ہو جائیں۔ فریضۂ نیابت نبوت کی اس ادائیگی کے بعد اب قوم کے لئے کوئی حیل و حجت اور عذر و بہانہ نہیں رہے گا۔ اور نہ آئندہ

یہاں کے مسلمان شکوہ و شکایت کر سکیں گے کہ علمائے حق نے براہِ راست قوم کی رہنمائی کے لئے میدانِ سیاست میں کودنے سے دریغ کیا، علمائے حق کے بس میں یہی ہے۔ آگے فیصلہ قوم پر ہے کہ وہ سیاست کی شعبدہ بازیوں میں پھنس کر قدرت کے دئے ہوئے اس سنہری موقعہ کو ضائع کرتے ہیں یا پھر سنبھل کر قرآن و سنت کو عملاً نافذ کرانے کے لئے علمائے حق کی عظیم اکثریت کو اسمبلی میں پہنچاتے ہیں۔ اتنی بڑی تعداد میں علمائے کرام و مشائخ کا اپنے دینی، علمی اور روحانی مشاغل اور مصروفیات چھوڑ کر اور گوشۂ خمولت سے نکل کر انتخابی میدان میں حصہ لینا شاید اس ملک کی تاریخ میں پہلا موقع ہے۔ اگر یہ موقع بھی قوم ضائع کرتی ہے تو نہیں کہا جاسکتا کہ اس اتمامِ حجت کے بعد آئندہ اس ملک کے قائم رہنے کی کیا صورت ہوگی۔ —— یہ حضرات علمائے کرام اور اکابر وقت مشائخ بارگاہِ ایزدی میں یہ تو کہہ سکیں گے کہ ہم نے تو درگذر نہ کی جو ہم سے ہو سکا۔

عام سیاسی حالات، مسلمانوں کی دین سے برگشتگی، سیاستدانوں کی اسلام کے بارہ میں غیر مخلصانہ بلکہ منافقانہ روش، پارٹی اور جماعت کے نام پر گروہ بندیاں، باہمی تعصب و تحزب کی بناء پر نہیں کہا جاسکتا کہ علمائے حق آئین ساز اسمبلی تک پہنچنے میں کامیاب بھی ہو سکیں گے یا نہیں —— مگر حصولِ رضائے الٰہی، دینِ حق کے فروغ کے لئے جہاد، اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے جدوجہد اور وراثتِ نبوت کی بناء پر فریضہ کی ادائیگی کے لئے تو ایسے لوگ ہر صورت میں اس میدان میں کامیاب اور سرخرو ہوں گے کہ اصل کامیابی تو یہی ہے۔ اگر خدانخواستہ ظاہری حالات میں کوئی دوسری صورت ظاہر ہو جاتی ہے تو اس کی ساری ذمہ داری قوم پر ہوگی اور روسیاہی بھی اگر ہوگی تو پوری قوم کی اور علمائے حق کہہ سکیں گے۔ کہ ؎

سودا قمارِ عشق میں شیریں سے کوہکن ۔۔۔ بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا
کس رو سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز ۔۔۔ اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

ہمیں اسلام اور وطنِ عزیز کے نام پر اور خدائے حیّ و قیوّم سے کئے گئے عہد میثاق کے واسطہ سے پوری توقع ہے کہ وہ جہاں بھی ہوں جس پارٹی اور جتھے سے بھی تعلق رکھتے ہوں ہر قسم گروہ بندی اقرباء پروری، قبیلہ اور قوم علاقائی اور وطنی یا نظریاتی بندھنوں سے آزاد ہو کر آنے والی مرکزی اسمبلی کے لئے اپنے ووٹ کی امانت اپنے علاقہ کے ان امیدواروں کے حق میں استعمال کریں گے جو قرآن و سنت کے مستند عالم ہیں۔ دینی فرائض

اور وظائف کی ادائیگی ان کا شیوہ ہے، عوام کو ان کی رسوخ علمی اور خشیت خداوندی پر اعتماد ہے۔ اور خود ان کا یقین بھی صرف اور صرف اسلام پر ہے جو خیر القرون کا اسلام تھا، صحابہؓ اور تابعین ائمہ عظام کا اسلام تھا۔ کتاب و سنت اور تضایائے سلف پر مبنی اسلام ۔ یہی لوگ آئین سازی کے اہل ہیں اور ان لوگوں کا ترتیب دیا ہوا آئین ہی ملک کی کشتی کو موجودہ منجدھار سے نکال کر ساحل تک پہنچا سکتا ہے ۔

★

آئین سازی کے محدود وقت کے پیش نظر علماء کرام پر بھی ایک نازک ذمہ داری عائد ہوتی ہے ۔ کہ وہ علمی اور سیاسی مشاغل سے کچھ وقت نکال کر اور باہمی رنجشوں کو بھول کر آئین سازی کے بنیادی خطوط، طریق کار پر بھی ابھی سے غور و فکر شروع فرمالیں۔ بنیادی اور اصولی چیزوں کا خاکہ تیار کریں جہاں تک اسلامی آئین کا تعلق ہے ۔ بحمد للہ اس کے اصول تو کیا تفصیلات تک میں علماء کرام کے تمام مکاتب فکر اور مختلف طبقے متفق ہیں۔ اس بارہ میں اختلاف اور افتراق کا افسانہ کھڑا کر کے تجدد پسند اور لادین عناصر اسلامی آئین سے فرار کا راستہ ڈھونڈتے ہیں۔ علماء حق چاہیں تو آپس میں قرار داد مقاصد اور متفقہ بائیس نکات پر ابھی سے آئین کے لئے از سر نو تجدید عہد کر سکتے ہیں۔ اور انہی چیزوں کو بنیاد بنا کر ۵۴ء، ۵۶ء، ۶۲ء کے آئینوں سے بھی استفادہ کر سکتے ہیں جو چیزیں قرآن و سنت کے مطابق نظر آئیں انہیں لے لیا جائے اور جو باتیں اسلامی اور عوامی اقدار کے منافی یا کسی شخصی یا گروہی اغراض پر مبنی نظر آئیں انہیں چھوڑ دیا جائے اگر ابھی سے اس کام کو زیر غور رکھا گیا اور تیاری شروع کر لی گئی۔ اور اسمبلی میں جانے والے تمام افراد نے آئین کے حق میں مخلصانہ اور خیر خواہانہ روش اختیار کیا تو انشاء اللہ ۱۲۰ دن نہیں، دس دن میں بھی ملک کو اسلامی آئین مل سکے گا۔ اور اگر ارکان کے انتخاب، آئین کی ترتیب و تدوین وغیرہ امور میں قوم اور اسمبلی اپنی اسی روش پر چلی جو پچھلے ۲۳ سال کا شیوہ رہا تو ۱۲۰ دن تو کیا ایک سو بیس سال میں بھی یہ قوم کسی پائیدار اور مستحکم اسلامی آئین اور اسکی برکات سے مالا مال نہیں ہو سکے گی ـــــ حق تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل ۔

سمیع الحق

ضبط و ترتیب : ادارۃ الحق

الدین یسر ——— زکوٰۃ اور عشر کا فلسفہ

(خطبۂ جمعۃ المبارک ۴ ستمبر ۱۹۷۰ء)

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم الدین یسر

محترم بزرگو ! ہم سب اللّٰہ جل جلالہٗ کی مخلوق ہیں، اور ہمارے پاس جو کچھ بھی نعمت ہے وہ خداوند کریم کی دی ہوئی ہے ۔ وما بکم من نعمۃ فمن اللّٰہ ۔ جو نعمت بھی ہے ہاتھ پاؤں آنکھ، کان، زبان، حیات، زندگی اور وجود، مال، دولت اولاد، زمین، مکان، سلطنت غریبی اور امیری سب کچھ اللّٰہ کی طرف سے انعام ہے۔ اوپر سے ہمیں ظاہری و باطنی نعمتوں سے اللّٰہ نے ڈھانپ دیا۔ واسبغ علیکم نعمہٗ ظاہرۃً و باطنۃً ۔ اور ہم جب لاالٰہ الا اللّٰہ کا کلمہ طیبہ پڑھتے ہیں تو گویا یہ ایک معاہدہ ہے خداوند کریم سے کہ اے اللّٰہ میری زندگی کا ہر کام، ہر شعبہ، ہر عمل تیرے قانون اور منشاء کے مطابق ہوگا اور وہ قانون اللّٰہ کا دین اسلام ہے جو سیدنا و شفیعنا و حبیبنا سید المرسلین خاتم النبیین نبی کریم صلی اللّٰہ علیہ وسلم کے واسطہ سے ہمیں ملا۔ اب ہمیں اس دین کا پابند رہنا ہوگا۔

انّ صلوٰتی ونسکی ومحیای ومماتی للّٰہ رب العالمین ۔ میری زندگی اور موت میری عبادت اور قربانی خالص اللّٰہ کی رضا کیلئے ہوگی وہ اللّٰہ جو سارے عالم کا پالنے والا ہے اور ایک جگہ ارشاد فرمایا : انّ اللّٰہ اشتریٰ من المؤمنین انفسھم واموالھم بان لھم الجنۃ۔ مسلمانوں کی جان اور مال اللّٰہ نے خرید لیا ہے جنت کے بدلہ میں مسلمان اللّٰہ کی راہ میں جہاد کرتا ہے تو جان مال عزت و آبرو اللّٰہ کی راہ میں لٹاتا ہے اس لئے کہ یہ سب کچھ اللّٰہ پر فروخت کر دیا ہے اور اس کے بدلہ اللّٰہ نے اس سے جنت کا وعدہ فرمایا ہے ۔ الغرض ہمارے ساتھ جو کچھ بھی ہے اپنا اور خود ساختہ نہیں، نہ کسی اور نے دیئے ہیں۔ بلکہ اللّٰہ کا دیا ہوا ہے ۔۔۔ تو

ہماری حیثیت اُس غلام کی ہے جسے خزانچی بنا دیا جائے اور خزانچی اس کو کہتے ہیں کہ اس کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ اس کا صرف نگران ہے۔ وہ اس میں جو بھی تصرف کرے آقا کی اجازت اور اشارہ کے مطابق کرے گا۔ اپنی طرف سے کچھ بھی اختیار نہیں۔ اور ایک خزانچی اسے اپنی عیش وعشرت میں لگا دے۔ ملازم ہے اور ملازمت کا وقت اپنے کاموں میں لگائے تو سب اُسے خزانچی نہیں بلکہ خائن اور غاصب کہتے ہیں۔ نہ ایسا ملازم تنخواہ کا حقدار سمجھا جاتا ہے۔ تو دنیا میں مجازی مالک خواہ عوام میں سے ہو یا خواص حکومت ہوں یا رعایا اگر انہیں کوئی چیز بطور امانت دیدیں تو وہ تصرف کا مجاز نہیں ہوتا۔ اپنے طرف سے ذرہ بھر بھی تصرف نہیں کر سکتا۔ جبکہ مجازی مالکوں کا اللہ جیسے مالک حقیقی سے کوئی نسبت ہی نہیں۔ اس لئے کہ ہر نعمت کا موجد اس کا بنانے اور پالنے والا اللہ ہی ہے۔ مجازی مالک ایسا کب کرسکتا ہے۔ وہ مالک حقیقی سب کچھ ہمیں دے دیتا ہے۔ البتہ سال بعد شخصی اموال میں زکوٰۃ کا حکم دیتا ہے۔ پھر دین کی آسانی کو دیکھئے کہ جب تو حکومت نظم ونسق چلائے تو لوگوں سے ٹیکس لیتی ہے اور ٹیکسوں کا حال آپ کو معلوم ہے جس پر ٹیکس لگایا گیا ہے۔ خواہ اس کی حالت جیسی بھی رہی ہو تنگی ہو یا سہولت، نفع کمایا یا نقصان، وہ قرض لیکر دے گا مگر ٹیکس معاف نہیں ہوگا۔ ٹیکس مالیہ وغیرہ ہر حال میں حکومت وصول کرتی ہے، خواہ دینے والے کی صلاحیت اور طاقت ہو یا نہیں۔

—— مگر اللہ کی شان کریمانہ دیکھئے کہ تجھے مال کا امین بنایا کہ جائز طریقوں سے اسے خرچ کرو۔ اہل وعیال خویش اقارب دوست احباب پر لگایا کرو، البتہ اسے ظلم اور فساد کا ذریعہ نہ بناؤ، اسراف اور تبذیر نہ کرو۔ اس پر مخاصمت نہ کرو۔ اور اگر سال بھر یہ مال آپ کے پاس ذاتی ضروریات پر خرچ ہوتا رہا اور سال بعد جب دیکھا تو پھر بھی مالیت ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کے برابر روپیہ یا اتنا ہی سامانِ تجارت موجود ہے اور تم قرضدار نہیں ہو تو حکم دیا کہ اس میں زکوٰۃ دو وہ بھی سو میں پچاس فیصد نہیں، پچیس فیصد نہیں جبکہ دنیا میں بعض اوقات اس سے بھی زائد ٹیکس میں سے لیا جاتا ہے۔ بلکہ صرف ڈھائی فیصد ادائیگی کا حکم دیا گویا ۱/۴۰ اللہ کیطرف سے زکوٰۃ کا حکم ملا۔ زمین کی اُس پیداوار کا یہی حال ہے، جو زمین کی قیمت بڑھانے کیلئے ہو، گھاس پھوس نہ ہو بلکہ وہ زمین کی نمو اور ترقی کے لئے ہو تو اگر بارش سے ہوا ہو تو دسواں (عشر) دیدو کہ آبیانہ اور آبپاشی کا بوجھ بھی نہیں اٹھایا۔

اللہ نے بارش برسائی، اُسے اگایا بغیر کسی زیادہ محنت کے کاشتکار کو پیداوار ملی۔ اور اگر مشین کنواں، رہٹ وغیرہ سے آبپاشی کی ہو تو بیسواں حصہ (نصف العشر) ادا کرنا ہوگا۔ الغرض اس میں بھی مصلحت رکھی کہ یہ اموال کا وجوب تجدید عہد کی ایک صورت ہے کہ اپنے آپ کو مال و دولت میں اللہ کا نائب اور خزانچی سمجھے کہ اصل مالک اللہ ہے اور کسی مالک کے حکم کے بغیر کوئی تصرف کرنا چوری اور ڈاکہ ہے۔ لیکن جب اپنے کو غلام سمجھتے ہو تو رب العزت کو اس عہد کی تجدید اور تسلیم و انقیاد کا ثبوت زکوٰۃ و عشر کی شکل میں دینا پڑے گا۔ تاکہ پتہ چلے کہ یہ غاصب ہے یا خزانچی۔ اب کوئی زکوٰۃ ادا کرنے کے قابل ہو اور نہ ادا کرے تو گویا اس کا عقیدہ اللہ کی ربوبیت اور خالقیت کا بدل گیا ہے۔ اور اپنے آپ کو خود مختار اور مالک حقیقی سمجھنے لگا ہے۔ باغی ہے خزانچی نہیں۔ اور جو خزانچی باغی ہو جائے تو مالک اُس سے مال و دولت چھین کر کسی وفادار اور دیانتدار خادم کو دیدیتا ہے۔ اس لئے اللہ نے اپنے فرمانبردار غلاموں کو حکم دیا کہ ظالم باغی اور سرکش بندوں کے مال و دولت پر تمہیں اختیار دیدیا گیا انہیں جہاد میں قتل کر سکتے ہو ان کے اموال چھین سکتے ہو۔ اسے جہاد اور غنیمت سے تعبیر کرتے ہیں۔

قرآن مجید میں عموماً اقیموا الصلوٰۃ کے ساتھ اللہ نے وآتوا الزکوٰۃ کا بھی حکم دیا ہے۔ پہلا جملہ نماز کی ادائیگی کرنا بندہ کے وفادار غلام ہونے کی علامت ہے۔ اس لئے کہ نماز میں جو عجز و بندگی ہے۔ اتنی کسی اور عمل یا عبادت میں نہیں۔ تو فرمایا کہ اسے غلام اب تجھے خزانچی بھی بنادیا، مال و دولت بھی دیدی۔ اب تجھے اموال کا مالک بناتا ہوں اس میں بھی اپنی غلامی اور بندگی کا ثبوت زکوٰۃ کی شکل میں دیتے رہو۔ اور یہی نکتہ ہے نماز اور زکوٰۃ کے اتصال کا کہ عبادات کی ادائیگی سے مال و دولت کی فراخی بھی آئے گی اور حکومت و سلطنت بھی مل جائے گی۔ اس لئے قرآن میں جگہ جگہ ایمان اور عمل صالح پر خلافت ارضی کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اور تمکین فی الارض حکومت و سلطنت کا مقصد اقامت صلوٰۃ، ادائیگی زکوٰۃ اور امر بالمعروف نہی عن المنکر بتلایا گیا ہے۔ نماز کی فرضیت سے جسم اور جان پر اللہ کی ملکیت تسلیم کرنے کا اعتراف ہوگا اور نماز پانچ وقت فرض کی گئی۔ مگر اس میں بھی اتنی سہولتیں رکھی گئی ہیں کہ دنیاوی کسی نوکری یا ملازمت میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ جو حالت بھی ہو ملازم ڈیوٹی پر جائے گا۔ مگر دین میں یہ تنگی نہیں۔ ماجعل علیکم فی الدین من حرج۔ طوفان ہو، بارش ہو تو

گھر میں نماز پڑھو، بیمار ہے صاحب عذر ہے تو بیٹھ کر پڑھے یہ بھی نہ ہو سکے تو بیاد پائی پر لیٹ کر اشارہ سے پڑھے۔ اندھا ہے لنگڑا ہے تو گھر میں پڑھے، پانی کے استعمال پر قادر نہ ہو تو تیمم کرے۔ سفر میں ہے۔ تو صلوٰۃ قصر یعنی ۴ رکعت فرض کی بجائے دو رکعت پڑھے۔ کیا دنیا کے کسی اور قانون میں اتنی گنجائش ہے۔؟ کہ عدالت میں حاضر ہونے کی بجائے گھر میں بیٹھ کر حاضری لگا دے۔

—— الغرض ہر عبادت بدنی میں اس کی ملکیت جسمانی کا اعتراف ہے وہ جسم جو اللہ پر فروخت کر دیا گیا ہے ہمارا ہے کیا؟ سب خداداد ہے۔ اسی طرح سہولت نماز زکوٰۃ کے علاوہ دیگر عبادات میں بھی ہے۔ حج بھی استطاعت پر موقوف ہے۔ زکوٰۃ میں حولانِ حول اور نصاب کی شکل میں سہولت ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے دین میں جو اور سہولتیں ہیں اس کا بھی حد و حساب نہیں۔

بعض ادیان میں گناہوں کی سزا قتل نفس تھی، گھر پر لکھ دیا جاتا کہ یہ مجرم ہے فلاں جرم کیا ہے۔ کپڑا پلید ہو جاتا، تو اُسے کاٹ دیا جاتا یا جلا دیا جاتا۔ تیمم کی گنجائش نہ تھی، نماز صرف مسجد میں ادا ہو سکتی تھی۔ اسلام کہتا ہے کہ جتنا بھی بڑا گناہ کیوں نہ کیا ہو۔ اس پر اظہار ندامت کرو، روؤ، استغفار کرو۔ اللہ تعالیٰ سب کچھ معاف کر دے گا۔ التائب من الذنب کمن لا ذنب لہٗ۔ پھر گناہ ہو گیا تو پھر آجاؤ۔ توبہ کرو ے

صد بار اگر توبہ شکستی باز آ این درگہ ما درگہ نومیدی نیست

ہاں حقوق العباد معاف نہیں ہوتے۔ جب تک کہ ادا نہ کئے جائیں۔ حقوق العباد میں اللہ تعالیٰ کی حق تلفی بھی ہو جاتی ہے۔ اس گناہ کا ازالہ رونے دھونے سے ہو جائے گا مگر بندہ کا حق ادائیگی سے ہی معاف ہو گا۔ گویا یہ بھی اللہ تعالیٰ نے ہم عاجزوں کے حقوق کی پاسداری کے لئے لازم کرایا کہ اوروں کو نقصان نہ ہو۔

الغرض پورا دین اتنا آسان اور پھر اتنا نفع بخش کہ دین و دنیا کی سرخروئی حاصل ہو جائے۔ دنیا و آخرت کا اس میں نفع ہو جس طرح اللہ نے اس دین کے صدقے صحابہ کرامؓ کو دنیا و آخرت کا چاند اور سورج بنا دیا۔ ایک بے آسرا اور بغیر آلات و وسائل قوم کے ذریعہ دنیا میں حکومت عادلہ قائم کر دی۔ ہر ایک جنت کا پھول اور باغ بن گیا۔ اور سب سے بڑھ کر رضائے الٰہی کی نعمت پر فائز ہوئے۔ اور اگر عبادات اور احکام میں بعض مرتبہ کچھ تنگی اٹھانی بھی پڑھ جائے

تو آخرت کی کامیابی کے بدلے اس کی کیا حیثیت ہے۔ کاشتکار اور دکاندار ذرا سے نفع کے لئے سال بھر مشقت کرتا ہے تو یہ تنگی کہاں اس کے بدلے میں عرش کے سایہ میں بیٹھنا نصیب ہوگا۔ جبکہ اور کوئی سایہ نہ ہوگا۔ ۵۰ ہزار سال کا دن ۲ رکعت نفل ادا کرنے کے وقت کے برابر ہو جائے گا۔ پھر اگر عبادات میں کچھ پابندی بھی ہو تو کیا۔ دنیا کے سارے کاموں میں پابندی نہیں؟ کھانے پینے، لباس پہننے، قضائے حاجت کرنے میں پابندی نہیں؟ گھر بار اہل وعیال کی ذمہ داریاں اٹھانے میں پابندی نہیں؟ ملازمت، تجارت میں پابندی نہیں؟ اگر یہ سب کچھ نفع کی خاطر کرنا پڑتا ہے تو دین کو بھی نہایت خوشی سے اپنانا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس آسان دین پر عامل بنادے آمین۔　　واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

حضرت شمس الحق افغانی مدظلہ
جامعہ اسلامیہ بہاولپور

اسراء و معراج

حضور علیہ السلام کے ایک مخصوص سفر و سیر کا نام اسراء معراج ہے۔ اس سفر کا پہلا زمینی وسفلی حصہ جو مکہ معظمہ سے بیت المقدس تک ہے۔ اس کا نام اسراء ہے۔ اور مسجد اقصیٰ سے عالم بالا کے آخری منزل تک کے سفر کا نام معراج ہے۔ پہلا حصہ سورۂ بنی اسرائیل کے اول میں اور دوسرا حصہ معراج کا سورۂ نجم کے اول میں مذکور ہے۔ اس واقعہ کی تفصیلات احادیث میں مذکور ہیں۔ زرقانی نے شرح مواہب لدنیہ میں لکھا ہے۔ کہ واقعہ معراج کو ۴۵ صحابہؓ نے حضور علیہ السلام سے نقل کیا ہے۔

آراء مختلفہ در بارۂ معراج | اس واقعہ میں مندرجہ ذیل امور میں اختلاف رائے موجود ہے۔ (۱) معراج کا آغاز کس مکان سے ہوا۔ (۲) یہ واقعہ کس تاریخ کو پیش آیا۔ (۳) اس واقعہ کی کیفیت کیا تھی روحانی یا جسمانی منامی یا استیقاظی (۴) اس سفر کی آخری حد کہاں تک تھی۔

۱۔ قرآن حکیم کا بیان یہ ہے۔ کہ سفر معراج مسجد الحرام سے شروع ہوا۔ سبحان الذی اسریٰ بعبدہٖ لیلاً من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ ۔ وہ خدا جو ہر نقص سے پاک ہے۔ جو رات کو لے گیا اپنے خاص بندے کو مسجد الحرام سے مسجد الاقصیٰ تک۔ صحیحین میں انس بن مالک نے مالک بن ابی صعصعہ کی روایت سے بیان کیا ہے۔ کہ آغاز سفر حطیم اور حجر سے ہوا۔ حطیم اور حجر چونکہ ایک چیز ہے اور یہ مسجد الحرام میں واقع ہے۔ لہٰذا یہ روایات قرآن کے خلاف نہیں۔ نسائی میں ابن عباس کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آغاز سفر ام ہانیؓ کے گھر سے ہوا۔ بخاری میں ابوذر کی روایت فرج سقف بیتی دانا بمکہ۔ کہ میرے گھر کی چھت پھٹ گئی اور میں مکہ میں تھا۔ سے معلوم ہوتا ہے کہ خود حضور کے گھر سے اس سفر کا آغاز ہوا۔ واقدی کی روایت ہے کہ یہ سفر شعب ابی طالب سے شروع ہوا۔ یعنی اس درہ سے جس میں ابی طالب کا گھر تھا۔ ان تمام روایات میں کوئی اختلاف نہیں سفر کی تیاری ام ہانیؓ کے

گھر سے ہوئی جو شعب ابی طالب میں واقع تھا۔ اور چونکہ حضور اس گھر میں سکونت کرتے تھے تو بہ لحاظ سکونت گویا سفر کا آغاز حضور کے مسکن یعنی گھر سے ہوا۔ اور باقاعدہ سفر مسجد الحرام سے شروع ہوا۔ اور مسجد حرام میں بالخصوص اس جگہ سے جو حجر اور حطیم کہلاتا ہے۔

۲- تعین سال یا زمانِ معراج :- یہ سفر کس سال پیش آیا۔ مختار قول یہ ہے کہ معراج کا واقعہ ہجرت سے ایک سال پہلے پیش آیا۔ یعنی نبوت کے بارہویں سال۔ نووی ؒ نے فتاویٰ میں اس کو مختار کہا۔ اور ابن حزم کا اس پر اجماع نقل کیا۔

تعین ماہ :- معراج کس مہینے میں ہوا، اس میں اگرچہ ربیع الاول، ربیع الآخر، رمضان اور شوال کے اقوال بھی موجود ہیں۔ لیکن امام نے کتاب الروضہ میں ماہِ رجب کو ترجیح دی ہے۔ رجب میں ستائیس رجب کی تاریخ کو ابن عبدالبر نے دی۔ عبدالغنی المقدسی نے ترجیح دی ہے۔

تعین رات :- اگرچہ اس میں سنیچر اور جمعہ کی شب کی روایت ضعیفہ بھی مذکور ہے۔ لیکن مختار قول یہ ہے کہ معراج کا واقعہ پیر کی رات کو پیش آیا۔ ابن اثیر اور ابن منیر نے اس کو مختار کہا ہے۔

کیفیت سفرِ معراج :- یہ سفر جسم اور روح دونوں کے ساتھ بیداری میں ہوا۔ یہی قول جمہور اہلِ اسلام، علماء اور محققین، صحابہ اور تابعین کا ہے۔ اس کے خلاف بعض اہل الحاد نے اس کو خواب یا روحانی واقعہ قرار دیا ہے۔ اور اس کو حسن بصریؒ، حضرت عائشہؓ اور حضرت معاویہؓ کی طرف منسوب کیا۔ حسن بصری کی طرف انتساب کسی صحیح روایت سے ثابت نہیں۔ البتہ حضرت عائشہؓ اور حضرت معاویہؓ کی روایت صحاح ستہ میں نہیں۔ سیرت ابن اسحاق میں مذکور ہے۔ دونوں کے متعلق صحیح رائے یہ ہے کہ ثابت نہیں۔ حضرت عائشہؓ کی روایت کے متعلق روح المعانی میں مذکور ہے۔ فانہ لم یصح عنہا کما فی البحر۔ شاید یہ روایت درست نہیں جیسے کہ تفسیر بحر المحیط میں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ حضرت عائشہؓ کی روایت کی سند ان الفاظ میں مذکور ہے۔ حدثنی لبعض آل ابی بکر۔ یعنی یہ روایت مجھ کو ابوبکر کے خاندان والوں میں سے پہنچی ہے۔ وہ شخص جو ابوبکر کے خاندان سے تھا۔ وہ مذکور نہیں تاکہ اس کو جانچا جائے۔ راوی نے یہ روایت خود حضرت عائشہ سے نہیں سنی۔ لہٰذا اصول الحدیث کے قواعد کے تحت یہ روایت منقطع مجہول اور مردود ہے۔

حضرت معاویہؓ کی روایت :۔ حضرت معاویہؓ کی روایت کی سند سیرۃ ابن اسحاق عن یعقوب بن عتبہ بن المغیرہ بن الاخنس یعنی امیر معاویہؓ سے روایت کرنے والا راوی یعقوب بن عتبہ ہے جسکو امیر معاویہؓ سے نہ ملاقات ہے۔ اور نہ ہی اس نے اس کا زمانہ پایا ہے۔ ائمہ رجال نے لکھا ہے۔ ھو لم یدرک زمن معاویہ۔ اس راوی نے حضرت معاویہؓ کا زمانہ نہیں پایا۔ لہذا یہ روایت منقطع مجہول اور مردود ہوئی۔ اس لئے نہ حضرت عائشہؓ سے یہ ثابت ہے کہ یہ واقعہ خواب کا ہے۔ اور نہ حضرت معاویہؓ سے لہذا ان حضرات کیطرف بیداری میں معراج کے سفر کا انکار غلط ہے۔

درایت :۔ درایت اور عقل کے لحاظ سے بھی حضرت عائشہؓ اور حضرت معاویہؓ کی واقعہ معراج کی بیداری کا انکار غلط ہے۔ واقعہ معراج بالاتفاق ہجرت سے قبل کا ہے۔ اور کم از کم ایکسال ہجرت سے پیشتر کا ہے۔ اس وقت حضرت عائشہؓ صغیرۃ السن اور بچی تھی۔ اور حضورؐ کی زوجیت میں داخل نہیں ہوئی تھی۔ حضرت معاویہؓ واقعہ معراج کے وقت مشرف بہ اسلام نہ ہوئے تھے۔ بلکہ واقعہ معراج سے آٹھ نو سال بعد مشرف بہ اسلام ہوئے۔ لہذا معراج کے واقعہ میں ان صحابہؓ کی روایت ہی نہیں ہے۔ جو اس واقعہ کے وقت بڑی عمر کے تھے۔ اور مشرف بہ اسلام تھے۔ اور خود حضور علیہ السلام سے جو صاحب واقعہ تھے۔ انہوں نے واقعہ کی حقیقت سنی تھی۔ وہ سب روایات صاف دلالت کرتی ہیں۔ کہ واقعہ بیداری اور جسمانی کی شکل میں پیش آیا۔ نیز رویت باری کے متعلق حضرت عائشہؓ کا انکار و استدلال جو صحیحین میں مذکور ہے۔ اس امر کی دلیل ہے کہ حضرت عائشہؓ اس سفر کا بیداری اور جسمانی صورت میں ہونے کے قائل تھی۔ صرف آنکھ کے ذریعے اللہ کو دیکھنے میں متردد تھی۔ ورنہ خواب میں خدا کے دیکھنے کا کون انکار کرسکتا ہے۔

اہل الحاد کے استدلال روایانی پر بحث :۔ حدیث شریک انا بین النائم والیقظان یا روایۃ فاستیقظ۔ کہ میں نیند اور بیداری کی حالت میں تھا۔ یا یہ کہ پھر حضور جاگے۔ اس کا جواب اولاً یہ ہے کہ شریک راوی کثیر الغلط ہے۔ اور محدثین نے اس روایت میں اسکی غلطی کی تصریح کی ہے۔ کہ اس نے اپنے بیان میں بے ترتیبی کی ہے۔ دوم یہ کہ امام قرطبیؒ نے اسی حالت کو ابتداء پر محمول کیا۔ کہ جب سفر معراج کے لئے تشریف لے جانے لگے تو آپ نیند اور بیداری کی درمیانی حالت میں تھے۔ پھر بیدار ہوئے۔ یا محدثین کے نزدیک انتہائے سفر

پر محمول ہے۔ جب حضور علیہ السلام نے سفر معراج طے کیا۔ اور واپس مسجد حرام تشریف لائے تو تھکان کی وجہ سے سو گئے۔ پھر بیدار ہوئے۔ اس تطبیق کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ عام مشہور روایات جو اس سفر کی بحالت بیداری جسمانی طور پر ہونے پر دال ہیں۔ یہ روایت ان کے مطابق ہو جائے۔ ورنہ شریک راوی کی روایت کو غلطی پر محمول کرنا پڑے گا۔ کہ اس نے ابتداء سفر یا انتہاء سفر کی حالت کو درمیانی واقعہ میں بیان کیا ہے۔ اسی طرح قرآن پاک کی آیت: وماجعلنا الرؤیا التی اریناک الا فتنۃ للناس والشجرۃ الملعونۃ فی القرآن۔ کہ ہم نے نہیں کیا اس دکھاوے کو جو آپ کو دکھایا اور برا درخت مگر لوگوں کے ایمان کے امتحان کے لئے۔ اہل زیغ والحاد نے جس طرح شریک کی مخلوط روایت سے استدلال کیا۔ اسی طرح اس آیت سے بھی استدلال کیا کہ قصۂ معراج منامی واقعہ ہے۔ کیونکہ معراج کے واقعے کے لئے آیت مذکور میں لفظ رویا استعمال کیا گیا ہے۔ جو خواب کی معنی میں آتا ہے۔ یہ استدلال بھی غلط ہے۔ اس وجہ سے کہ یہ لفظ دکھاوے کے معنی میں عربی زبان میں استعمال ہوتا ہے۔ خواہ خواب میں دیکھنا ہو یا بیداری میں۔ امام لغت صاحب قاموس نے تصریح کی ہے کہ لفظ رویا جسم کی آنکھ سے دیکھنے کے معنی میں آتا ہے۔ نیز شعراء قدیم میں سے روعی نے رویا کو آنکھ سے دیکھنے کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ وہ شکاری کی تعریف کر کے لکھتا ہے ؎

وکبر للرویا وھش فنواده وبشر قلبا کان جما بلابله

شکاری نے شکار کو دیکھ کر اللہ اکبر کہا اور اس کا دل خوش ہوا اور ایسے دل کو خوشخبری سنائی جسکی پریشانیاں بہت تھیں۔ اس شعر میں جسمانی طور پر دیکھنے کے لئے لفظ رویا کو استعمال کیا گیا ہے۔ متنبی شاعر نے بھی اسی معنی میں رویا کو استعمال کیا وہ اپنی ممدوح بدر کی تعریف میں کہتے ہیں ؎

مضی اللیل والفضل الذی لک لایمضی ورویاک احلی فی العیون من الغمض

رات ختم ہوئی اور تیری خوبی ختم نہیں ہوتی۔ تیرا دیکھنا آنکھوں میں نیند سے زیادہ شیریں ہے۔ یہاں لفظ رویا بیداری کی حالت میں استعمال ہوا۔ ان دلائل سے قطع نظر اگر رویا خواب اور بیداری دونوں حالتوں کے دیکھنے کیلئے مشترک ہے۔ تو خود قرآن نے اس کا بیداری کی حالت میں دیکھنے کا معنی متعین کر دیا۔ کہ قرآن نے اس دکھاوے کو جو حضور علیہ السلام نے معراج میں دیکھا فتنۃ للناس کہہ کر امتحان ایمان قرار دیا۔ اور بموجب روایات اہل مکہ امتحاناً حضورؐ سے

بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ کے احوال دریافت کئے اگر یہ خواب کا واقعہ ہوتا۔ تو اس میں نہ فتنہ تھا اور نہ ایمان کا امتحان اور نہ دریافت کی ضرورت۔ خواب میں تو اس سے بڑے واقعات بھی قابلِ تعجب نہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ واقعہ بیداری کا تھا۔

قرآن سے جسمانی معراج کا ثبوت | قرآن کریم نے سورۃ بنی اسرائیل میں واقعہ معراج کو اس انداز میں بیان کیا ہے۔ کہ جس سے معراج کا جسمانی ہونا خود بخود واضح ہوتا ہے۔ ظاہر ہے۔ کہ ابتداء سفر سے لیکر انتہائے سفر تک ایک جیسی حالت تھی۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ کہ اس واقعہ کا کچھ حصہ جسمانی طور پر بیداری میں ہو۔ اور کچھ روحانی ہو اور خواب ہو۔

سورۂ بنی اسرائیل کی آیت یہ ہے: سبحان الذی اسریٰ بعبدہٖ لیلاً من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ الذی بارکنا حولہٗ لنریہٗ من اٰیاتنا انہ ھو السمیع البصیر۔ اس قرآنی ارشاد میں جسمانی معراج کے ثبوت حسب ذیل ہیں۔ واقعہ کا آغاز لفظ سبحانؔ سے ہوا۔ جو تعجب کے لئے اور اظہارِ قدرت کے لئے استعمال ہوتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ معراج تعجب انگیز بھی ہے اور ظہورِ قدرت خداوندی کی نشانی بھی ہے۔ اور یہ اس صورت میں ممکن ہے کہ واقعہ معراج جسمانی ہو خواب نہ ہو۔ کیونکہ خواب کیسا بھی ہو نہ اس میں اللہ کے اعتبار سے تعجب انگیزی ہے۔ اور نہ اسکی عظیم قدرت کا ظہور ہے۔

بعبدہٖ کے لفظ میں ظاہر کیا گیا ہے کہ واقعے کا تعلق جسم اور روح دونوں سے ہے۔ کیونکہ عبد روح و جسد دونوں کے مجموعے کا نام ہے۔ نہ صرف روح کا ورنہ خدا یوں فرماتا۔ اسریٰ بروحہٖ۔ لفظ عبد عبادت سے ماخوذ ہے اور عبادت جسم اور روح کے مجموعے سے متعلق ہے جیسے سورہ جن میں حضور علیہ السلام کے بارے میں آیا ہے۔ وانہٗ لما قام عبد اللہ۔ یا سورہ اقراء میں ارءیت الذی ینھیٰ عبداً اذا صلی۔ عبد سے حضور علیہ السلام کا مجموعہ روح و جسد مراد ہے۔ اسی طرح تمام قرآن میں جہاں کہیں لفظ عبد آیا ہے۔ روح و جسم کے مجموعے کے لئے استعمال ہوا۔ تو واقعہ معراج میں بھی وہی معنی مراد ہے۔

تیسری وجہ لفظ اسراء ہے جو قرآن اور لغت عرب میں روح و جسم کے مجموعے کو رات کے وقت لے جانے کا نام ہے۔ جیسے حضرت لوط علیہ السلام کو قرآن کا ارشاد ہے۔ واسر باھلک۔ آپ اپنے اہل کو رات کے وقت لے چلو نہ یہ کہ ان کی روح کو لے چلو۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خدا کا حکم ہوا۔ ان اسر بعبادی لیلاً انکم متبعون۔

اے موسیٰ میرے بندوں کو رات کے وقت لے چلو۔ یقیناً تمہارا تعاقب کیا جائے گا۔ ان دونوں آیتوں میں وہی لفظ آیا ہے۔ جو واقعہ معراج کے بیان میں آیا ہے۔ یعنی اسریٰ کا لفظ۔ لیکن دونوں جگہ جسمانی سیر مراد ہے۔ نہ کہ خواب یا روحانی سیر۔ اسیطرح واقعہ معراج کو بھی سمجھنا چاہیے۔ "واقعہ معراج پر عقلی بحث" اس واقعے پر عقلاً چند شبہات پیش کئے جا سکتے ہیں۔

۱۔ کہ اس واقعہ کا مقصد اگر خدا کو دیکھنا تھا۔ تو اس سفر کے بغیر بھی ممکن تھا۔ سفر کرانے کی کیا ضرورت تھی۔ جواب اولاً یہ ہے کہ قرآن نے خود مقصد سفر بیان کیا ہے۔ لنیریہ من آیاتنا۔ کہ اس سفر کا مقصد عالم بالا کی اشیاء کو دکھانا ہے۔ جن کے دیکھنے سے اللہ کی عظیم قدرت کا ظہور ہوتا ہے۔ مثلاً عرش، قلم، لوح محفوظ۔ سدرۃ المنتہیٰ جنت وغیرہ

۲۔ یہ کہ عالم بالا جو گناہوں سے پاک ہے۔ اور عجائبات قدرت کا محل ہے۔ وہاں لے جانے میں خاتم الانبیاء علیہم السلام کے اعزاز و اکرام کا ظہور ہے۔

دوسرا شبہ یہ ہے کہ اس سفر میں حر و قر یعنی گرمی و سردی سے حفاظت کا کیا انتظام تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب انسان نے جب ائیرکنڈیشن کے ذریعے گرمی سردی کا انتظام کیا ہے۔ تو قادر مطلق اور خالق کائنات کے لئے یہ کیوں ناممکن ہے۔ جس کے ارادے کے آگے تمام قوانین طبعیہ زیر فرمان اور مسخر ہیں۔ محققین یورپ نے تصریح کی ہے کہ جس ذات نے قوانین طبعیہ بنائے ہیں۔ اُن میں اس کو مداخلت اور تبدیلی کا بھی حق حاصل ہے۔ ہم نے ان کے مکمل حوالہ جات اپنی دوسری تصنیفات میں لکھے ہیں اور کسی قدر میری کتاب علوم قرآن میں بھی موجود ہیں۔

تیسرا شبہ یہ ہے کہ ایسا طویل سفر تھوڑے وقت میں کیونکر ممکن ہو سکتا ہے۔ اس شبہ کے جوابات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ فلسفۂ قدیم و جدید اس امر پر متفق ہیں کہ حرکت کی تیزی اور سرعت کے لئے عقلاً کوئی حد مقرر نہیں کی جا سکتی۔ جس زمانے میں جس قدر حرکت ممکن ہے اس زمانے کے کروڑویں حصے میں بھی وہ حرکت ممکن ہے۔ اس بناء پر سرعت حرکت معراجیہ پر شبہ کرنا اور اس کو ناممکن قرار دینا دونوں فلسفوں کے خلاف ہے۔ البتہ مشاہدہ میں ایسی تیز حرکت نہ آنے کی وجہ سے تعجب انگیز ضرور ہے۔ جیسے ہوا، تیز رفتار، بیز رائل قبل از مشاہدہ پہلے زمانہ

میں محل تعجب تھے۔

۲۔ اس سفر میں جو سواری استعمال ہوئی ہے جسکو براق کہا جاتا ہے۔ اور برق اور بجلی کی تیز رفتاری ضرب المثل ہے۔ پھر براقیت کے بھی مختلف درجات ہیں۔ اگرچہ عالم سفلی کی بجلی ہو۔ لیکن اگر یہ براقیت عالم علوی کی ہو جنکی قوت ما درالعقل ہے۔ تو اس کی سرعت رفتار بے نظیر ہوگی بالخصوص جبکہ حدیث کے مطابق حد نگاہ کی دوری اس کے لئے ایک قدم تھا۔۔۔۔

۳۔ اس سواری کا اوّلاً شوخی کرنا اور پھر جبرائیل کے تبلانے پر شرم و حیا کی وجہ سے پسینہ پسینہ ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ یہ سواری صاحب عقل تھی۔ اگرچہ عقل کو خدا ہر ایک چیز میں پیدا کرسکتا ہے۔ بلکہ ہر چیز میں کسی قدر عقل ہے، جیسے کل قد علم صلاتہ وتسبیحہ۔ کائنات کی ہر چیز اپنی دعا و تسبیح کو جانتی ہے۔ سے معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ ہوسکتا ہے کہ ملکی قوت کو اس سواری کی شکل میں تشکل کر دیا گیا ہو۔ اور یہ سواری ملکی قوت کا مجسمہ ہو اور ملائکہ کے لئے یہ مسافت طے کرنا ایک لمحے کا کام ہے۔

۴۔ شاہ ولی اللہ اور دیگر محققین صوفیہ کے بیان کے مطابق جسم پر بعض وقت روح کے احکام غالب آجاتے ہیں۔ جبکہ روح زیادہ پاک اور لطیف ہو ایسی صورت میں جسم اپنا ثقل چھوڑ کر تابع روح بن جاتا ہے۔ خود اس احقر کا ایک فاضل متقی مرید

کو دوران ذکر یہ حالت پیش آتی، یہاں تک کہ جسم کا ثقل اور دباؤ ختم ہوا۔ اور وہ چارپائی جو پہلے بیٹھنے سے دبتی تھی اس حالت کے ا[illegible] چارپائی نہیں دبتی تھی۔ اس مضمون کو صدر شیرازی نے اسناد اربعہ میں مدلل بیان کیا ہے تو کیا حضور علیہ السلام کی روح جو افضل الارواح ہے اس کے بھی احکام بدن حضور علیہ السلام پر غالب آئے اور جسطرح روح کے لئے ملائکہ کیطرح تھوڑے وقت میں عالم بالا کو پہنچنا آسان ہے۔ حضور علیہ السلام کے لئے بھی واقعہ معراج میں ایسا ہوا۔

۵۔ قدیم فلسفہ میں پتھر کا اوپر سے زمین پر جلد پہنچنا میلان مرکز کا نتیجہ ہے۔ اور جدید فلسفہ میں کشش زمین کا نتیجہ ہے۔ تو یہ بھی ممکن ہے کہ واقعہ معراج میں روح محمدی کو بوجہ کشش عرش یا کشش الٰہی کے دفعتہً عالم بالا میں پہنچنے کی نوبت آئی ہو۔ اور سواری صرف اعزاز و اکرام کے لئے ہو یا دونو چیزوں کو دخل ہو۔

۶۔ احادیث صحیحہ میں روانگی سفر معراج سے قبل حضور علیہ السلام کا شق صدر کیا گیا۔ اور سینہ آپ کا چیر کر اس میں عالم علوی کی کوئی چیز ڈالدی گئی۔ جس سے آپ کی روحانی قوت میں اضافہ مقصود تھا۔ اور آپ کی ذات میں اس عجیب سفر کے لئے قابلیت اور استعداد پیدا کر کے وہ قوت عطا کرنی بھی مقصود تھی جو ملائکہ کو حاصل ہے تاکہ تھوڑے وقت میں ملائکہ کیطرح یہ سفر بآسانی طے ہو سکے۔ اگرچہ یہ قوت ملکی آپ کے لئے وقتی ضرورت کے تحت ہو۔ اور ملائکہ کے لئے دائمی۔ کیونکہ ان کی آمد و رفت کی ضرورت عالم بالا کو دائمی ہو۔

۷۔ روحِ محمدی جو الطف الاشیاء ہے۔ اس کا ایک رات میں جسم پر اثر ڈال کر ایک رات میں طویل سفر کرنا اسکی نظیر لطیف اشیاء میں موجود ہے۔ سورج کی شعاع نو کروڑ تیس لاکھ میل چند سیکنڈ میں طے کر کے زمین پر پہنچتی ہے۔ ہماری آنکھ کی شعاع رات کے وقت ایک لمحہ میں کھربوں میل مسافت طے کر کے بعید ترین ستاروں تک پہنچتی ہے۔ ■■

گذشتہ سے پیوستہ

(۲)

تحریر : علامہ محمد اسد
ترجمہ : محمد معین خان بی اے

اسلامی اور مغربی تہذیب کا بنیادی فرق

اسلامی ثقافت سے امنڈتی ہوئی تجدید شباب کی لہروں نے یورپ کے بہترین دماغوں کو ایک نئی قوت اور ایک نئی توانائی کے ساتھ کلیسا کے تباہ کن اقتدار سے نبرد آزما ہونے کے قابل بنا دیا تھا۔ اس مقابلہ نے شروع میں اصلاح دین کی تحریکوں کا روپ اختیار کیا جو یورپ کے مختلف ملکوں میں ایک ساتھ وجود میں آئی تھیں اور ان کا مقصد یہ تھا کہ مسیحی طریق فکر کو زندگی کے نئے تقاضوں کے ہم آہنگ بنایا جائے۔ یہ تحریکیں فی نفسہ صحت مند تھیں۔ اگر انہیں حقیقی روحانی کامیابی سے ہم کنار ہونے کا موقع مل جاتا تو یہ یورپ میں سائنس اور مذہب کے مابین کسی حد تک مفاہمت کرا دیتیں۔ لیکن چونکہ قرونِ وسطیٰ کے کلیسا کے ظلم و زیادتی نے یورپ کے قلب و دماغ پر ایسے گہرے گھاؤ لگائے تھے کہ محض اصلاح و تجدید دین سے ان کا اندمال ہونا ممکن نہ تھا۔ مزید برآں خود اصلاحِ دین کی تحریکیں بڑی سرعت کے ساتھ مفاد پرست گروہوں کی سیاسی جدوجہد کی صورت میں ذلیل و خوار ہو گئیں۔ مسیحیت صحیح معنی میں اصلاح پذیر ہونے کی بجائے پہلے مدافعانہ اور پھر رفتہ رفتہ متعذرانہ رویّہ اختیار کرنے پر مجبور ہو گئی۔ کلیسا ——— کیتھولک ہو کہ پروٹسٹنٹ ——— اپنی ذہنی بازی گریوں سے، ناقابل فہم عقیدوں سے تحقیر عالم کے جذبہ سے انسانیت کے مظلوم طبقات کے اتلاف حقوق کے معاملہ میں موجود الوقت حکومت کی ناعاقبت اندیشانہ تائید سے دست کش نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنی ان بھاری ناکامیوں کی بے جا دلیل کرنے اور اپنے کھوکھلے دعوؤں کے ذریعہ ان کی کچھ نہ کچھ توجیہ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس لئے کوئی تعجب کی بات نہیں کہ جوں جوں زمانہ آگے بڑھتا گیا، یورپ پر مذہبی فلسفہ کی گرفت ضعیف سے ضعیف تر ہوتی چلی گئی۔ تاآنکہ اٹھارویں

صدی میں انقلاب فرانس اور دیگر ممالک میں اس انقلاب کے ثقافتی نتائج کی بلاخیز موجوں نے کلیسا کی کشتی اقتدار کے پرخچے اڑا دیئے۔

اس وقت کے حالات سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ اس مرتبہ بھی ایک نئی روحانی تہذیب کو جو متکلمانہ الٰہیات کی ستم شعارانہ ظلمتوں سے نجات حاصل کر چکی تھی، سرزمین یورپ میں پروان پڑھنے کا ایک اچھا خاصا موقع میسر آگیا تھا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں فلسفہ، آرٹ، ادب اور سائنس کی اقالیم میں یورپ کے بعض دماغ اور روحانی اعتبار سے بعض بے انتہا طاقتور شخصیتیں منظر شہود پر ابھر آئی تھیں۔ لیکن زندگی کا یہ روحانی تصور صرف چند افراد تک محدود رہا۔ یوروپی عوام ایک زمانہ دراز تک ایسے مذہبی عقائد کی قید و بند میں مبتلا رہنے کے بعد جن کا انسان کی فطری کوششوں سے کوئی تعلق ہی نہ تھا۔ اس قابل نہیں رہ گئے تھے کہ ان زنجیروں کے ایک دفعہ ٹوٹ جانے کے بعد مذہب کے صحیح راستہ پر چل نکلنے

یورپ کے مذہبی احیاء کی راہ میں حائل ہونے والا سب سے بڑا عقلی عامل شاید وہ مروجہ تصور تھا جس کی رو سے حضرت مسیح علیہ السلام "ابن اللہ" قرار پاتے تھے۔ یہ سچ ہے کہ فلسفیانہ ذہن رکھنے والے مسیحیوں نے ابنیت کے تصور کو اس کے اپنے حقیقی معنوں میں کبھی بھی قبول نہیں کیا۔ وہ اس تصور سے پیکر انسانی میں رحمت باری کا ظہور مراد لیتے تھے، لیکن ہر شخص کا ذہن فلسفیانہ نہیں ہوا کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ مسیحیوں کی بہت بڑی اکثریت "ابن" کے وہی معنی مراد لیتی تھی جو لغت میں پائے جاتے تھے۔ اگرچہ اس لفظ میں ایک قسم کی سریت کی چاشنی بھی موجود رہی۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے بارہ میں ابن اللہ کے تصور نے لوگوں کو قدرتی طور پر عقیدہ تجسیم کی راہ پر ڈال دیا جس کی رو سے اللہ تبارک تعالیٰ نے ایک سفید لہراتی ہوئی داڑھی والے شفیق و مہربان بڑھے کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اللہ تعالیٰ کی یہ شکل جسے بیشمار اعلیٰ درجہ کی ماہرانہ تصویروں نے دوام بخش دیا تھا، اہل یورپ کے تحت شعور پر نقش کا لحجر بن کر رہ گئی۔ جس زمانہ میں یورپ میں کلیسائی عقیدہ کے اقتدار کا سکہ رواں تھا۔ اس عجیب و غریب تصور کے خلاف آواز اٹھانے پر کوئی مائل ہی نہیں ہوتا تھا۔ لیکن جوں ہی قرون وسطیٰ کی ذہنی بندشیں ایک دفعہ ٹوٹ گئیں تو ایک طرف یورپ کے مفکرین انسان نما خدا باپ کے تصور پر راضی نہ ہو سکے تو دوسری طرف تجسیم کا نظریہ خدا

کے مقبول عام تصور میں ایک مستقل عامل کی صورت اختیار کر گیا۔ جب روشن خیالی کو پھیلے ہوئے ایک زمانہ گذر گیا تو یورپی مفکر طبعی طور پر کلیسائی تعلیم کے پیش کردہ تصور باری سے ڈر کر پیچھے ہٹ گئے۔ حالانکہ یہی وہی واحد تصور تھا جس کے وہ کبھی عادی ہو چکے تھے۔ اب انہوں نے خود تصور باری اور اس کے ساتھ مذہب کو بھی مسترد کرنا شروع کر دیا۔

مزید برآں صنعتی ترقی نے بھی اپنی تمام عظیم الشان مادی ترقی کی سحر طرازیوں کے ساتھ لوگوں کو نئی نئی دلچسپیوں کیطرف راغب کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس طرح اس ترقی نے یورپ میں مذہبی خلاء پیدا کرنے میں نمایاں حصہ لیا۔ اس خلاء میں مغربی تہذیب کے فروغ نے ایک المناک پلٹا کھایا — المناک اس شخص کے نقطۂ نظر سے جو مذہب کو حیات انسانی کی قوی ترین صداقت سمجھتا ہے۔ سابقہ کلیسائی غلامی سے آزاد ہونے کے بعد جدید یورپی ذہن نے متعینہ حدیں توڑ دیں۔ اور رفتہ رفتہ اپنے اطراف ہر قسم کے مقتضیات روحانی کے خلاف بغض و عناد کی خندقیں کھود دیں۔ اس تحت شعوری خوف کی بناء پر کہ مبادا روحانی اقتدار کی طاقتیں کہیں دوبارہ مسلط ہو جائیں۔ یورپ اصول و عمل میں ہر مذہب دشمن چیز کا مؤید و مددگار بن گیا۔ یعنی وہ اپنے قدیم رومی ورثہ کیطرف رجعت کر گیا۔

ان حالات کے مدنظر وہ شخص ہرگز مستوجب ملامت نہیں ہو سکتا جو یہ حجت پیش کرتا ہو کہ مغرب کو ان شاندار کامرانیوں سے ہم کنار ہونے کے قابل بنانے والی مسیحیت کی وہ "برتری" نہ تھی جو اسے دیگر ادیان پر حاصل تھی۔ اس لئے کہ اگر یورپ کی عقلی طاقتیں خود مسیحی کلیسا کے اصولوں کے خلاف اپنی تاریخی جدوجہد نہ جاری رکھی ہوتیں تو ان کامرانیوں کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یورپ کا موجودہ مادہ پرستانہ تصور دراصل مسیحی روحانیت سے یورپ کا انتقام ہے، جو زندگی کی فطری سچائیوں کی راہ سے بھٹک کر بہت دور جا پڑی تھی۔

ہم مسیحیت اور جدید مغربی تہذیب کے نجی تعلقات کی گہرائی میں نہیں جانا چاہتے۔ جدید مغربی تہذیب اپنے تصورات و منہاجات میں مذہب کی اس قدر شدید مخالف کیوں ہے۔ اس کے متعلق ہم نے تین وجوہ بتلانے کی کوشش کی ہے جو غالباً سب سے بڑے وجوہ ہیں۔ پہلی وجہ رومی تہذیب کا ورثہ اور حیات انسانی اور اسکی قدر ذاتی کے بارہ میں اس تہذیب کا انتہائی مادہ پرستانہ رویہ ہے۔ دوسری وجہ مسیحی تحقیر دنیا اور انسان کی

فطری خواہشوں اور اسکی جائز کوششوں کو دبانے کے خلاف فطرت انسانی کی بغاوت ہے (اس پر مستزاد سیاسی و معاشی ارباب لیست وکشاد کے ساتھ کلیسا کی روایتی رفاقت اور ارباب اقتدار کی ہر اس تجویز کی دیدہ دانستہ تائید ہے جو استحصال ناجائز کے لئے وضع کی جاتی تھی۔) اور تیسری وجہ اللہ تعالیٰ کا تجسیمی تصور ہے۔ مذہب کے خلاف یہ بڑی کامیاب بغاوت تھی ۔۔۔ اس قدر کامیاب کہ مسیحیت کے مختلف فرقے اپنے بعض عقائد کو یورپ کے بدلتے ہوئے سماجی اور ذہنی احوال سے ہم آہنگ کرنے پر مجبور ہوگئے تھے۔ اپنے متبعین کی سماجی زندگی پر اپنے اثرات مرتب کرنے اور اس کو خاص اپنی سمت پھیرنے کے بجائے جیساکہ ہر مذہب کا بنیادی فریضہ ہوتا ہے۔ مسیحیت نے ایک مرغوب قسم کی ریت رسم کی وضع اختیار کرلی اور ایک سیاسی مہم جوئی کی عبا پہن لی۔ عوام الناس کے نزدیک مسیحیت صرف ایک رسمی معنی رکھتی ہے۔ بعینہٖ جیسے قدیم رومیوں کے دیوتاؤں کا معاملہ تھا جنہیں نہ سماج پر کوئی حقیقی اثر ترتیب کرنے کی اجازت تھی اور نہ ان سے اس تبدیلی کی کوئی توقع ہی کی جاسکتی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مغرب میں اب بھی بعض ایسے افراد موجود ہیں جو مذہبی انداز میں سوچتے ہیں اور مذہبی انداز میں محسوس کرتے ہیں۔ اور اپنے عقائد کو اپنی تہذیب کی روح سے ہم آہنگ کرنے کی جان توڑ کوشش بھی کرتے ہیں۔ لیکن ان کی حیثیت استثنائی ہے۔ اوسط درجہ کا مغربی خواہ وہ جمہوریت پسند ہو کہ آمریت پسند، سرمایہ دار ہو کہ بالشویکی، جسمانی محنت کرنے والا ہو کہ دماغی ۔۔۔ صرف ایک ہی ایجابی "مذہب" جانتا ہے، اور وہ ہے مادی ترقی کی پرستش اور یہ عقیدہ کہ زندگی کا مقصود اس کے سوا کچھ نہیں کہ حیات دنیاوی کو زیادہ سے زیادہ آسودہ بامروجہ محاورہ کے مطابق "فطرت سے بے نیاز" بنایا جائے۔ دیو ہیکل فیکٹریاں، سینمائیں، کیمیاوی تجربہ خانے، ناچ گھر، پن بجلی کارخانے اس مذہب کی عبادت گاہیں ہیں اور بنکار، انجینئر، فلمی ستارے، ملوں کے مالک اس مذہب کے پروہت و پیشوا ہیں۔ اس آرزوئے اقتدار و انبساط کا ناگزیر نتیجہ سرتاپا مسلح مخالف گروہوں کا وجود ہے۔ جب کبھی اور جہاں کہیں ان گروہوں کے مفادات باہم متصادم ہوتے ہیں۔ تو وہ ایک دوسرے کو ہلاکت دنیا ہی کے گھاٹ اتارنے کے درپے ہوجاتے ہیں۔ اس کا ثقافتی نتیجہ ایک ایسی ہیئت انسانی کی تخلیق ہے جس کا اخلاقی نظام صرف عملی افادیت تک محدود ہوتا ہے اور جس کا عظیم ترین معیار خیر و شر مادی کامیابی ہے۔

اس وقت مغرب کی سماجی زندگی جس زبردست قلب ماہیت میں سے گذر رہی ہے۔ اس میں یہ نیا افادیت پسندانہ نظام اخلاق روز افزوں عیاں ہوتا چلا جا رہا ہے۔ وہ تمام محاسن و اوصاف جو معاشرہ کی مادی فلاح سے براہ راست تعلق رکھتے ہیں مثلاً فنی کارکردگی، جذبۂ حب وطنی، قوم پرستانہ گروہ بندی، ان کی خوب مدح سرائی کی جاتی ہے۔ اور ان کی قدر کے بارے میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دئیے جاتے ہیں۔ درآنحالیکہ ایسے محاسن و اوصاف جو ابھی حال تک خالص اخلاقی نقطۂ نظر سے قابل قدر تھے مثلاً فرزندانہ محبت و سعادت مندی یا جنسی وفا شعاری، وہ سب بڑی سرعت کے ساتھ اپنی اپنی اہمیت کھوتے چلے جا رہے ہیں۔ اس لئے کہ ان سے معاشرہ کو کوئی محسوس قسم کا مادی فائدہ نہیں پہنچتا۔ اس دور کا خاتمہ کیا جا رہا ہے جس میں مضبوط خاندانی رشتے گروہ یا قبیلہ کی فلاح و بہبود کے لئے قطعی طور پر ناگزیر سمجھے جاتے تھے۔ اس کی جگہ ایک ایسے دور کے کھونٹے گاڑے جا رہے ہیں جس میں مجموعی تنظیم (COLLECTIVE ORGANISATION) وسیع تر عنوانات کے تحت زور پکڑتی جا رہی ہے۔ ایک ایسے معاشرہ میں جو بنیادی طور پر حرفیاتی (TECHNOLOGICAL) ہے اور جسے خالص میکانیاتی (MECHANICAL) خطوط پر بے انتہا سرعت کے ساتھ منظم کیا جا رہا ہے، باپ کے ساتھ بیٹے کا برتاؤ اس وقت تک کسی بڑی سماجی اہمیت کا مسئلہ نہیں بنتا جب تک کہ باپ بیٹے اپنے باہمی برتاؤ میں شائستگی کے ان عام حدود کو ملحوظ رکھتے ہیں جو معاشرہ نے اپنے اراکین کے میل جول اور راہ و رسم پر عائد کر رکھے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ مغربی باپ کا اپنے بیٹے پر سے حق دار اختیار روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے۔ اور منطقی اعتبار سے بیٹے کے دل میں باپ کی عزت و تعظیم گھٹتی جا رہی ہے۔ باپ بیٹوں کے باہمی تعلقات آہستہ آہستہ ختم کئے جا رہے ہیں۔ اور ان تعلقات کو ہر قسم کے عملی اغراض کے لئے، ایک ایسے مشینی معاشرہ کے مسلمات کا عدم بناتے جا رہے ہیں جس کا رجحان یہ ہے کہ ایک فرد کے دوسرے فرد پر جو حقوق ہوتے ہیں اور اس تصوّر کے منطقی ارتقاء کے مطابق ــ وہ حقوق بھی جو خاندانی رشتہ کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں، ان سب کو یک قلم موقوف کر دیا جائے۔

اس کے پہلو بہ پہلو "قدیم" جنسی اخلاق کا بھی تدریجی طور پر خاتمہ ہوتا جا رہا ہے۔ مغرب جدید میں جنسی وفا شعاری اور انضباط بہت تیزی کے ساتھ قصۂ ماضی بنتے

جا رہے ہیں کیونکہ یہ زیادہ تر اخلاقیات پر موسس ہیں اور اخلاقی ملحوظات معاشرہ کی مادی فلاح و بہبود پر کوئی محسوس اور فوری قسم کا اثر مرتب نہیں کرتے۔ اس طرح جنسی تعلقات میں ضبط و انضباط کا عنصر بھی بڑی تیزی کے ساتھ اپنی اہمیت کھوتا جا رہا ہے اور اسکی جگہ ایک ایسا نیا نظام اخلاق اپنے قدم جما رہا ہے جو جسم انسانی کی بے قید و بند انفرادی آزادی کا اعلان کرتا ہے مستقبل میں جنسی پابندی صرف وہی ہوگی جو ولادت و اموات کے اعداد و شمار اور اصلاح نسل کے ملحوظات کے مدنظر عائد کی جا سکے گی۔

یہ دیکھنا دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ مذہب دشمن ارتقاء جس کا سطور بالا میں ایک مجمل خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ سویٹ روس میں کسطرح اپنے منطقی کمال کو پہنچ گیا ہے۔ سویٹ روس کا ثقافتی فروغ ما لبقی مغربی دنیا کے ثقافتی فروغ سے بنیادی طور پر ذرا بھی مختلف نہیں ہے۔ اس کے برعکس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کمیونسٹوں کا تجربہ جدید مغربی تہذیب کے قطعی مذہب دشمن اور روحانیت دشمن رجحانات کے کمال اور ان کی بجا آوری کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ موجودہ سرمایہ دار مغرب اور کمیونزم کے مابین جو شدید قسم کا غبار پایا جاتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ وہ مختلف رفتاریں ہوں جن سے یہ متوازی تحریکیں جو اصلاً ایک ہیں اپنی مشترک منزل کیطرف بڑھتی جا رہی ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان تحریکوں کی باطنی مشابہت مستقبل میں زیادہ سے زیادہ آشکارا ہوتی چلی جائیگی۔ لیکن اس وقت بھی یہ مشابہت مغربی سرمایہ داریت اور کمیونزم دونوں کے اس بنیادی میلان میں اجاگر پائی جاتی ہے کہ انسان کی روحانی انفرادیت اور اخلاقیات کو ایک اجتماعی مشنری کے مادی تقاضوں کے آگے جھکا دیا جائے جسے معاشرہ کہتے ہیں جس میں فرد کی حیثیت پہیہ میں ایک دندانہ دار چکر کے سوا کچھ نہیں۔

ان تمام واقعات سے ہم صرف یہی ایک نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ اس قسم کی تہذیب ہر اس ثقافت کے حق میں زہر قاتل کا حکم رکھتی ہے، جسکی بنیادیں مذہبی اقدار پر قائم ہوں۔ اب ہم اپنے ابتدائی سوال کیطرف رجوع ہوتے ہیں کہ کیا اسلامی طریق فکر و حیات کو مغربی تہذیب کے تقاضوں کے مطابق بنا دیا جائے، اس کا جواب قطعی طور پر نفی میں دیا جانا چاہیئے۔ اسلام کا سب سے مقدم اور نمایاں مقصد انسان کی اخلاقی ترقی ہے۔ لہذا اس مذہب میں اخلاقی ملحوظات خالص افادیت پسندانہ ملحوظات کو کالعدم کر دیتے ہیں۔ جدید مغربی تہذیب میں

صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ یہاں مادی افادیت کے ملحوظات انسان کی تمام سرگرمیوں پر حاوی اور غالب ہیں۔ یہاں اخلاقیات زندگی کے تیرہ و تار پس منظر میں دھکیل دیئے گئے ہیں۔ اور انہیں اس حد تک خوار و زبوں کر دیا گیا ہے کہ ان کی حیثیت محض ایک نظریاتی وجود کی سی رہ گئی ہے جسے قومی زندگی پر رتی برابر بھی اثر مترتب کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ ایسے ماحول میں اخلاقیات کی باتیں کرنا مکاری و منافقت سے کچھ کم نہیں۔ جدید مغربی مفکروں میں جو لوگ پاکیزہ فہم و ذکا کے مالک ہیں۔ ان کے نظریات صرف اس صورت میں قابل جواز قرار دیئے جاتے ہیں جبکہ وہ مغربی تہذیب کے معاشرتی مقدرات کے متعلق اپنے قائم کردہ قیاسات میں ماورائی اخلاقیات کو راہ پانے نہ دیں۔ اور جہاں تک ان سے کم درجہ کے مفکروں نیز ان لوگوں کا تعلق ہے جو اپنے اخلاقی رویّہ کے بارہ میں کوئی واضح اور قطعی نظریہ نہیں رکھتے، ان کے پاس ماورائی اخلاقیات کا تصوّر فکر کے محض ایک غیر عقلی عامل کی حیثیت سے زندہ باقی ہے۔ بعینہٖ جیسے ماہر ریاضیات بعض "اصم" اعداد سے کام چلانے پر مجبور ہو جاتا ہے جو فی نفسہٖ کسی بیّن مقدار کی نمائندگی تو نہیں کرتے تاہم تخیل کے ان رخنوں کی بل بندی کے لئے درکار ہوتے ہیں جو ذہن انسانی کی ساخت کی تحدیدات ——— (STRUCTURAL LIMITATIONS OF HUMAN MIND) ——— کی بنا پر پیدا ہو جاتے ہیں۔

اخلاقیات کے بارہ میں اس قسم کے حیلہ جویانہ رویّہ کا مذہبیت کے ساتھ قطعاً کوئی میل نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ جدید مغرب کے اخلاقی اصل اصول کا بھی اسلام کے ساتھ کوئی میل نہیں ہو سکتا۔

لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ مسلمانوں کو علوم قطعیہ (EXACT SCIENCES) اور علوم اطلاقیہ (APPLIED SCIENCES) کی اقلیم میں مغرب سے تھوڑی بہت تشویق و تحریک حاصل کرنے سے بھی باز رکھا جائے۔ مگر یاد رہے کہ مغرب کے ساتھ ثقافت کا رشتہ صرف اسی نقطہ پر جوڑا جائے گا اور اسی نقطہ پر وہ ختم بھی کر دیا جائے گا۔ اس سے آگے بڑھنے، مغربی تہذیب کی ہو بہو نقل کرنے، اس کے طریق حیات پر گامزن ہونے اسکی معاشرتی تنظیم کو اپنانے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ خود اسلام جیسے عملی مذہب اور دینی ہیئت سیاسیہ کے وجود پر تباہ کن ضرب لگ جائے گی۔ ■■

علوم و معارف

مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رح

۱۔ لطیفہ کل جدید لذیذ | فرمایا : کُلُّ جَدِیْدٍ لَذِیْذٌ پر مجھے مولانا محمد قاسم صاحب رح کا لطیفہ یاد آیا کہ مولانا رح کا معمول تھا کہ امراء کو تو چٹنی ساگ پات کھلاتے تھے۔ اور غرباء کو پلاؤ زردہ اور مرغن کھلاتے۔ کسی نے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا قاعدہ ہے۔ کُلُّ جَدِیْدٍ لَذِیْذٌ نئی چیز مزیدار ہوتی ہے۔ تو میں اپنے مہمانوں کو نئی چیز کھلانا چاہتا ہوں تاکہ لذت زیادہ آئے۔ پس امراء کے لئے تو یہ معمولی کھانے جدید ہیں مرغن تو وہ اپنے گھر میں ہر روز کھاتے ہیں۔ اور غرباء کے لئے مرغن کھانے جدید ہیں۔ یہ تو مولانا کا لطیفہ تھا۔ ورنہ اصل وجہ یہ تھی کہ مولانا کے دل میں غرباء کی وقعت امراء سے زیادہ تھی۔ (اصلاح ذات البین صہ ۶ الافاضات الیومیہ صہ ۲۹۱/۲، راحت القلوب صہ ۳۹)

۲۔ نرمی سے نصیحت | فرمایا مولانا محمد قاسم صاحب رح کا واقعہ ہے کہ ایک خان صاحب مولانا رح کے بڑے دوست تھے، مگر لباس ان کا خلاف شریعت تھا۔ اور وہ جمعہ کے روز مولانا ہی کے پاس آکر غسل کرتے، کپڑے بدلتے اور جمعہ پڑھتے اور انداز سے یہ معلوم تھا کہ پکے آدمی ہیں۔ کہنے سے نہ مانیں گے۔ مولانا رح نے ایک جمعہ کو ان سے فرمایا کہ میاں آج دو جوڑے لیتے آئیے۔ ہم بھی تمہاری وضع کا لباس پہنیں گے۔ وہ صاحب بے حد متاثر ہوئے اور عرض کیا کہ خدا نہ کرے آپ مجھ خبیث کی وضع پر رہیں۔ آپ ہی مجھ کو ایک جوڑہ دیجئے۔ میں اسکو پہنوں گا۔ اور ہمیشہ کے لئے اس لباس سے توبہ کر لی۔ حق تعالیٰ نے نرمی میں خاصہ رکھا ہے جذب کا۔ (الافاضات الیومیہ صہ ۶۳/۳)

—— اس لئے ہمیشہ نرمی سے نصیحت کرنا چاہئے۔ شیخ سعدی مرحوم نے سچ فرمایا ہے کہ

درشتی و سختی نیاید بکار — بنرمی ز آید ز سوراخ مار

۳۔ دنیا عزت سے ملتی ہے | فرمایا : حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کا فرمانا یاد آگیا کہ دنیا ہمیں بھی ملتی ہے اور امراء کو بھی مگر اتنا فرق ہے کہ ہم کو عزت کے ساتھ ملتی ہے اور انکو ذلت کے ساتھ۔ مگر اس استغنا کا حاصل اپنی عزت کی حفاظت ہے نہ کہ امراء کی تحقیر کیونکہ کسی کی تحقیر بہت بڑی بات ہے۔ (الاضافات الیومیہ ص ۲۶ ج ۳)

۴۔ جس قدر علم بڑھتا ہے تقلید کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے | فرمایا : کہ ایک غیر مقلد نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی تقریر سن کر کہا کہ آپ مجتہد ہو کر تعجب ہے کہ تقلید کرتے ہیں۔ مولاناؒ نے فرمایا کہ مجھ کو اس سے زیادہ اس پر تعجب ہے کہ آپ غیر مجتہد ہو کر تقلید نہیں کرتے۔ اور میں کہتا ہوں کہ ان بزرگ نے اس سے تقلید کی ضرورت سمجھ لی ہوگی کہ جب اتنا بڑا شخص مقلد ہے تو ہم کس شمار میں ہیں حضرت جس قدر علم بڑھتا ہے تقلید کی ضرورت زیادہ محسوس ہوتی جاتی ہے۔ اس لئے کہ ان کے سامنے ایسے مواقع بہت آتے ہیں۔ جہاں اپنی رائے کام نہیں دیتی۔ (الافاضات الیومیہ ص ۱۴۲ ج ۳)

۵۔ شان مسکنت و غربت | فرمایا : حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی ایک طالب علم نے دعوت کی، آپ نے فرمایا کہ ایک شرط سے منظور ہے کہ خود کچھ مت پکانا گھروں میں جو تمہاری روٹیاں مقرر ہیں وہی ہم کو بھی کھلا دینا۔ اس نے منظور کر لیا۔ یہ ہے شان مسکنت اور غربت اور انکسار اور عاجزی کی کہ اتنا بڑا شخص اور اس طرح اپنے کو مٹائے ہوئے تھا۔

(الاضافات الیومیہ ج ۳ ص ۱۶۷)

۶۔ شان استغناء | فرمایا : حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کا قصہ ہے بریلی کے ایک رئیس نے غالباً چھ ہزار روپیہ پیش کیا کہ کسی نیک کام میں لگا دیجئے۔ فرمایا کہ لگانے کے بھی تم ہی اہل ہو تم ہی خرچ کر دو۔ اس نے عرض کیا کہ میں کیا اہل ہوتا۔ فرمایا میرے پاس اسکی دلیل ہے۔ وہ یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھ کو اہل سمجھتے تو مجھ کو ہی دیتے۔ تبسم فرماتے ہوئے حضرت حکیم الامتؒ نے فرمایا کہ اس کا جواب تو یہ تھا کہ حضرت! اللہ میاں دے تو رہے ہیں۔

(الاضافات الیومیہ ص ۱۹۹ ج ۲)

۷۔ محقق کی قسمیں | فرمایا : آجکل درویشوں کی دو قسمیں ہیں ایک محق۔ ایک مبطل۔ پھر محق کی دو قسمیں ہیں ایک محقق ایک غیر محقق۔ باستثناء محققین کے کہتا ہوں کہ آج محق بھی اسکی کوشش کرتے ہیں کہ امراء سے تعلق ہو۔ باوجودیکہ وہ اہل حق ہیں۔ ان کا مذاق نہیں، مگر

پھر بھی اس کی کوشش کرتے ہیں کہ امراء سے تعلق ہو گو انکی نیت بری نہیں مگر پھر بھی اس مذاق کا ضرر زیادہ ہے۔ اس لئے حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ اس سے بہت سختی کے ساتھ نفرت رکھتے تھے۔ لوگوں کو معلوم نہیں کہ ان لوگوں سے تعلق رکھنے میں گو حب دنیا بھی نہ ہو تب بھی بڑا مفسدہ ہے۔ جسکا بکثرت مشاہدہ ہو رہا ہے۔ (الافاضات الیومیہ ص ۲۱۲ ج ۴)

مثلاً وہ علماء کو دل سے حقیر سمجھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ علماء ہمارے سے محتاج ہیں اور ہمارے پاس دنیا ہے۔ اس لئے وہ ہماری خوشامد کرتے ہیں۔ حالانکہ درحقیقت اہل دنیا اہل دین کے محتاج ہیں۔ اہل دین بجز اللہ کے کسی کے محتاج نہیں۔

۸۔ اصلاح کیسے ہو سکتی ہے | فرمایا: کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کا یہ مقولہ سنا ہے کہ جس کا پیر بڑا نہ ہو۔ اس مرید کی اصلاح ہو نہیں سکتی۔ مولانا احمد حسن صاحب امروہیؒ بڑے نازک مزاج تھے۔ عالی خاندان تھے۔ دیوبند پڑھنے آئے، مولاناؒ نے دیکھا کہ صلاحیت ہے ان میں عالی دماغ ہیں۔ اب تربیت بھی ساتھ ساتھ شروع فرما دی۔ حضرت ان کو چاہتے بہت تھے۔ مگر اصلاح میں ذرا رعایت نہ کرتے تھے۔ کوئی جولاہا آتا دعوت کرنے فرماتے ایک لڑکا بھی ساتھ ہوگا۔ وہ خوشی سے قبول کر لیتے، کہیں چٹائی پر بیٹھ کر اور کہیں کمبل پر بیٹھ کر روٹی کھانی پڑتی۔ اس میں ترک تکلف کی عادت ڈالنا مقصود تھی۔ ایک گاؤں والا ایک گاڑھے کا تھان حضرت مولاناؒ کے واسطے لایا۔ حضرتؒ نے درزی کو بلا کر فرمایا کہ اس میں سے اس لڑکے کے واسطے کرتہ پاجامہ قطع کر کے سی دو۔ ان کو یہ معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کسی نے بندوق مار دی ہو۔ مگر پھر بھی پہننا پڑا اور سب تکلف طبیعت سے رخصت ہوا۔ گو لطافت اس وقت بھی رہی۔ لطافت تو فطری چیز ہے مگر کبر کا نام و نشان نہ تھا۔ غرض اصلاح اس طرح ہوتی ہے۔ اور گو اس متشددانہ طریق سے اصلاح کرنے کی ہمارے بزرگوں میں کثرت نہ تھی۔ مگر اس وقت اس کی بھی ضرورت نہ تھی کیونکہ پہلے طالبوں کی طبیعت میں سلامتی تھی اور اب نہیں۔ فرق کی وجہ یہی ہے۔ (الافاضات الیومیہ ص ۲۸ ج ۴)

اس ملفوظ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ پہلے امراء علم دین کے لئے کتنی صعوبتیں برداشت کرتے تھے۔ اب تو مدارس دینیہ میں امراء کی اولاد کا نام و نشان بھی نظر نہیں آتا ۔

واے ناکامیٔ متاع کارواں جاتا رہا　　　اور کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

مقولہ "پیر اڑا نہ ہو" کی بابت حضرت حکیم الامتؒ نے فرمایا کہ "حضرت مولاناؒ" نے ایک

لفظ میں حقیقت کو ظاہر فرما دیا۔ یہ ان بزرگوں کی رائے ہے۔ جو مجسم اخلاق تھے۔ (الافاضات الیومیہ ص ۱۰۵ ج ۲)

۹۔ بیقراری برداشت نہیں ہوتی | فرمایا: اہلِ محبت کے باب میں میری طبیعت حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ جیسی ہے۔ کسی اہلِ محبت کی بے چینی اور بے قراری برداشت نہیں ہوتی۔ یہی حضرتؒ کی حالت تھی کہ کسی اہلِ محبت کی بے چینی برداشت نہ فرما سکتے تھے۔ بشرطیکہ خلافِ شریعت نہ ہو اور اگر خلافِ شریعت ہو تو ایسی تیسی میں جائیں محبت بھی اور اہلِ محبت بھی۔ (الافاضات الیومیہ ص ۱۱۳ ج ۲)

۱۰۔ گریہ کیلئے سامان | گریہ کے مضمون پر ایک صاحب نے شیعوں کی مجالس کا ذکر کیا کہ وہ رونے ہی کو ذریعہ نجات سمجھتے ہیں اور اس کیلئے سامان مہیا کرتے ہیں۔ فرمایا کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ وہ رنج ہی کیا ہوا جو اتنے سامان کے بعد رونا آوے۔
(الافاضات الیومیہ ص ۲۷۶ ج ۲)

۱۱۔ تواضع | فرمایا حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ میرٹھ میں مثنوی شریف پڑھاتے تھے۔ ایک درویش بھی شریک ہوتے تھے۔ کئی روز مثنوی شریف سن کر کہتے ہیں کہ مولاناؒ اگر درویش ہوتے تو کیا اچھا ہوتا۔ انہوں نے ایک روز محبت سے کہا کہ میں آپ کو توجہ دینا چاہتا ہوں۔ ذرا بیٹھ جائیے۔ ان کی نیت یہ تھی کہ کیفیت محمودہ کا مولاناؒ پر القاء کریں۔ حضرت مولاناؒ براہ تواضع بیٹھ گئے۔ وہ متوجہ ہوئے۔ تھوڑی ہی دیر میں گھبرا کر کہنے لگے کہ حضرتؒ بڑی گستاخی ہوئی، معاف کیجئے۔ مجھ کو کیا خبر تھی کہ آپ کتنی دور پہنچے ہیں۔ اس سلسلہ میں فرمایا کہ ایک صاحب سے جنہوں نے مولاناؒ موصوف اور حضرت حاجی صاحبؒ کا درس مثنوی سنا تھا کسی نے پوچھا کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ اور حاجی صاحبؒ کے مثنوی پڑھانے میں کیا فرق ہے۔ کہا کہ حضرت حاجی صاحبؒ تو مثنوی پڑھاتے تھے اور مولانا نہ معلوم کیا پڑھاتے تھے۔ عجیب جواب ہے۔ دونوں پہلو نکل سکتے ہیں۔ ایک اور درویش نے کہا ہے کہ حضرت حاجی صاحبؒ کا مثنوی پڑھانا ایسا ہے کہ مکان کے اندر لے جا کر کھڑا کر دیا کہ خود دیکھ لو۔ (الافاضات الیومیہ ص ۲۹۹ ج ۲)

۱۲۔ مشتبہ مال سے بچنے کا اہتمام | فرمایا کہ بزرگوں نے مشتبہ مال سے بچنے کا بڑا اہتمام کیا ہے۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی ایک شخص نے دعوت کی۔ کھانا مشتبہ تھا۔ آپ نے اس کی دلجوئی کے لئے کھا تو لیا مگر گھر پر آ کر قے کر کے سب نکال دیا۔ اس میں ایک طالب علمانہ

سشبہ ہوسکتا ہے۔ وہ یہ کہ تناول کا ارتکاب تو ہو ہی چکا تھا، جو مذموم ہے۔ پھر ایسا کرنے سے کیا نفع ہوا۔ جواب یہ ہے کہ ایک تو فعل ہے کھانا وہ تو بیشک واقع ہو چکا مگر دوسری چیز ہے جزو بدن بننا۔ جزوِ بدن بننے سے جو ظلمت ہوتی اس سے بچاؤ کیا۔ جیسا حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بے خبری میں اجرت کہانت کا دودھ پی لیا تھا۔ جس پر کوئی مواخذہ نہ تھا۔ مگر پھر بھی خبر ہونے کے بعد قے کر دی۔ اس کا بھی یہی نفع تھا۔ حدیث کل لحم نبت من السحت فالنار اولیٰ بہ۔ (جو گوشت حرام مال سے پیدا ہوا ہے اس کیلئے آگ ہی بہتر ہے) میں اس طرف اشارہ بھی ہو سکتا ہے۔ باقی رہا شبہ کھانے کا تو وہ فتوےٰ سے حرام نہ تھا۔ دلجوئی کی مصلحت اس میں بھی کراہت پر راجح تھی۔ یہاں جزو بدن بننے کے متعلق ایک ضروری تنبیہ ہے کہ اگر حرام کا تناول بقصد نہ ہو تو محض جزو بدن بن جانا موجب نار نہیں پھر اشارہ کی حقیقت یہ ہو گی کہ گو یہ خود معصیت نہ ہو مگر اس سے اب مادہ پیدا ہو گا کہ وہ معصیت کیطرف داعی ہو گا۔ سو اگر مقاوم قوی نہ ہو تو بواسطہ صدور اختیاری کے نار کیلئے موجب ہو جائے گا۔ (الافاضات الیومیہ ص ۳۰ ج ۲)

۱۳۔ **حضرت حاجی صاحبؒ سے محبت** | فرمایا ایک مرتبہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے فرمایا کہ بھائی پڑھنا پڑھانا تو اور چیز ہے۔ مگر بیعت تو ہوں گے۔ حضرت امدادؒ ہی سے حضرت مولانا کو حضرت کے ساتھ عشق کا درجہ تھا۔ (الافاضات الیومیہ ص ۳۰۵ ج ۲)

۱۴۔ **نبیح الدین** | فرمایا: مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوتا تھا جسکو لوگ نبیا نبیا کہتے تھے۔ ایک دفعہ اس نے مولانا سے درخواست کی کہ میرا ایک خط لکھ دیجئے۔ مولانا نے خط لکھ دیا جب اس کا نام لکھنے لگے تو اس نے کہا، نبیا نہ لکھیے، نبی الدین لکھئے۔ مولانا نے مزاحاً فرمایا نہیں نبیح الدین ہو گا۔ اور یہ نباح سے مشتق ہے جسکے معنی بھونکنے کے ہیں مگر اسکو تو لغت کی کچھ خبر نہ تھی۔ وہ اسکو گاتا پھرتا تھا کہ میرا نام نبیح الدین ہے مجھے نبیا نہ کہا کرو۔ لوگ ہنستے تھے کہ بیوقوف یہ تو برا نام ہے۔ وہ کہتا واہ مولاناؒ نے میرا نام یہی لکھا ہے۔ (رجال البلبل ص ۲۶)

۱۵۔ **فن تعبیر میں مہارت** | فرمایا ایک زمانہ میں مولانا محمد منیر صاحب نانوتویؒ نے سرکاری اسکول میں ملازمت کے لئے گورنمنٹ کے یہاں درخواست دے رکھی تھی۔ اسی زمانہ میں خواب دیکھا کہ پیچھے سے کچھ بطین ان کے مکان کیطرف آرہی ہیں۔ یہ خواب مولانا محمد قاسم

صاحبؒ سے عرض کیا۔ فرمایا اگر مٹھائی کھلاؤ تو اور تعبیر ہے اور مٹھائی نہ کھلاؤ تو اور تعبیر ہے۔ انہوں نے مٹھائی کا وعدہ کیا تو فرمایا جاؤ تم بریلی میں بیس روپے کے ملازم ہو جاؤ گے۔ اور مٹھائی کا وعدہ نہ کرتے تو میں یہ تعبیر دیتا کہ گیارہ روپے کے ملازم ہو جاؤ گے۔ اس کی حقیقت پوچھنے پر فرمایا کہ لفظ بط کے عدد فارسی کے اعتبار سے گیارہ ہیں اور اس میں طؔ مشدد ہے۔ میں نے اسکو مکرر لے کر بیس سے تعبیر دی اور معبر کو یہ اختیار ہے چاہیے مکتوبی حروف کا اعتبار کرے یا ملفوظی کا۔ (استمداد التوبہ ص۳۱)

۱۶۔ غالب علی الاخلاق فرمایا، ایک صالح شخص کو محض تذکرہ سے لوگوں نے ایک مُردار کا عاشق بنا دیا۔ پھر اس شخص نے حضرت مولانا گنگوہیؒ اور حضرت مولانا محمد قاسمؒ سے مشورہ کیا کہ میں اس عورت سے نکاح کر لوں یا نہیں۔ حضرت مولانا گنگوہیؒ نے فرمایا کہ ہرگز نکاح نہ کرو، تم شریف خاندانی ہو اور وہ بازاری عورت ہے۔ اس سے نسل پر برا اثر پڑے گا۔ مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے یہ مشورہ دیا کہ نکاح کر لو۔ مولانا اس شخص کی حالت سے متاثر ہو گئے۔ اور یہ سمجھے کہ اسکی یہ بے قراری جبھی زائل ہو گی جبکہ اس سے نکاح کرے گا۔ اس واسطے مولاناؒ نے نسل کی خرابی پر نظر نہ کی۔ کامل الاخلاق دونوں تھے اور دونوں اسکی حالت سے متاثر ہوتے مگر ایک غالب علی الاخلاق تھے۔ ایک مغلوب علی الاخلاق تھے۔ اور یہ امر غیر اختیاری ہے۔ اس میں کسب کو دخل نہیں۔ حق تعالیٰ جس کو چاہیں غالب علی الاخلاق کر دیتے ہیں۔ اور جسکو چاہیں مغلوب علی الاخلاق کر دیتے ہیں۔ بلکہ بعض دفعہ ایک ہی شخص ایک خلق پر غالب اور دوسرے خلق سے مغلوب ہوتا ہے۔ یہ بھی غیر اختیاری ہے۔ اور گو کمال یہ ہے کہ سالک غالب علی الاخلاق ہو، مگر یہ کمال غیر اختیاری ہے۔ اس لئے اس میں ایک کو دوسرے پر رشک نہ کرنا چاہیے۔ (عصم الصوف عن رغم الانوف ص۲۶)

۱۷۔ تواضع (لباس) فرمایا حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی یہ حالت تھی کہ لباس ایسا پہنتے تھے جس سے کوئی نہ سمجھ سکے کہ یہ عالم ہیں، نہ عبا پہنتے تھے نہ چوغہ نہ ململ پہنتے تھے۔ نہ تنزیب بلکہ گاڑھا مارکین آپ کا لباس تھا اور اسی لباس سے آپ بڑے بڑے مجمعوں میں تشریف لے جاتے تھے مگر آپ کے سامنے سارے عبا اور جبہ والے دھرے رہ جاتے تھے۔ آپ ہی کا نام چمکتا تھا اور کسی کو کوئی پوچھتا بھی نہ تھا۔ چنانچہ مباحثہ شاہجہانپور میں جو مخالفین اسلام کے مقابلہ میں بڑا اعظیم الشان مناظرہ تھا۔ بڑے بڑے عبا قبا والے موجود

تھے اور حضرت مولانا اسی معمولی کرتہ اور لنگی میں تھے مگر جب آپ نے تقریر کی تو عوام پر اتنا اثر تھا کہ شاہجہان پور کے ہندو مہاجن اور بنیئے یہ کہتے تھے کہ نیلی لنگی والا مولوی جیت گیا۔ ایسی تقریر کی جیسے دریا بہتا ہے۔ کسی کو اسکی بات کا جواب نہیں آیا۔ نیز مولانا کی یہ بھی عادت تھی کہ سفر میں اپنا نام کسی پر ظاہر نہ کرتے تھے، اور ساتھیوں کو بھی ممانعت تھی کہ کسی پر نام ظاہر نہ کریں اور اگر کوئی آپ ہی سے پوچھتا کہ جناب کا نام کیا ہے۔ فرماتے خورشید حسین کیونکہ آپ کا تاریخی نام یہی ہے مگر اس نام سے لوگ واقف نہ تھے۔ اس لئے کوئی نہ سمجھتا کہ مولانا محمد قاسم صاحبؒ یہی ہیں۔ اور اگر کوئی وطن کا نام پوچھتا تو فرماتے الہ آباد، نانوتہ کا نام نہ لیتے۔ رفقاء نے کہا حضرت آپ کا وطن الہ آباد کدھر سے ہوگیا۔ یعنی یہ تو کذب ہے۔ فرمایا نانوتہ بھی خدا ہی کا آباد کیا ہوا ہے۔ پس لغتہً ہر بستی الہ آباد ہے۔ یعنی کذب لازم نہ آیا بلکہ توریہ ہوا۔ (وفی المعاریض مندوحۃ عن الکذب کمارقم حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی دامت برکاتہم فی الحاشیہ) ـــــ الفاظ القرآن ص۲۱

۱۸- فرمایا : جو تھے مژگان پر خوں سب وہ خار دلنشیں نکلے
جنوں پہ کیسے تیر نشتر کہیں ڈوبے کہیں نکلے

مولانا محمد قاسم قدس اللہ سرہٗ نے اس شعر کو ایک عجیب موقع پر لکھا ہے، بعض فرق باطلہ کا مذہب ہے کہ استدبار بالمرأۃ (دبر سے وطی کرنے سے) بھی حل قرار پاتا ہے ـــ مولاناؒ نے اس پر لکھا ہے کہ واقعی کیوں نہ ہو۔ اسکی وہی مثال ہے ؎

جو تھے مژگان پر خوں سب وہ خار دلنشیں نکلے
جنوں پہ کیسے تیر نشتر کہیں ڈوبے کہیں نکلے (الاستقامۃ ص۲۵)

۱۹- پاکیزگی فرمایا قرآن کی کیا بلاغت ہے کہ نہایت پاکیزہ پیرایہ میں اسکو بیان کیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں : كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ۔ یعنی مسیح علیہ السلام اور ان کی والدہ خدا کیسے ہوتے۔ یہ دونوں تو کھانا کھاتے تھے۔ اس میں اوّل تو یہ بات تلائی کہ کھانے والا بھوک سے عاجز ہو کر غذا کا محتاج ہوتا ہے اور خدا محتاج و عاجز نہیں ہوتا۔ دوسرے اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ کھانا کھانے والے کو بول و براز کی حاجت ہوتی ہے۔ اور بول و براز کرنے والا خدا کیا ہوتا۔ خدائی کی شان کے لائق یہی حرکات ہیں ؟ تو دیکھئے حالت بول و براز کو کیسے لطیف پیرایہ میں اشارۃً ادا فرمایا صراحۃً ذکر نہیں کیا۔ مولانا محمد قاسم صاحبؒ

نے ایک عیسائی کے سامنے یہ مضمون پیش کیا تو اس نے کہا کہ پیشاب پاخانہ کا نام نہ لو حضرت مسیح علیہ السلام کے ذکر میں ایسی گندی باتیں لانا بے ادبی ہے۔ مولانا نے کہا پیشاب پاخانہ کا نام بے ادبی ہے۔ تو بول و براز سہی۔ الفاظ کے بدلنے سے حقیقت نہیں بدل جائے گی۔ اس حقیقت کا وجود الوہیت کے منافی ہے۔ (ادج تنوج ص۱۹)

۲۰- فرمایا ہمارے حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے پاس بھی کپڑوں کی کوئی گٹھڑی نہ تھی، نہ کوئی ٹرنک بکس تھا۔ ایک مرتبہ کسی شخص نے مولانا کی خدمت میں چند ٹوپیاں بھیجیں۔ آپ نے ان کو تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ صاحبزادہ نے والدہ صاحبہ کی وساطت سے ایک ٹوپی مانگ لی۔ خود نہیں کیا۔ فرمایا ہاں تو بھی ایسی ٹوپی پہنے گا۔ ایسا دماغ بگڑا ہے اب یہ تکلف سوجھے گا۔ دیکھ تو میں کیسی ٹوپی پہنتا ہوں اور ان کے کپڑوں کی گٹھڑی دیکھی۔ تقدیر سے صاحبزادہ کی گٹھڑی بھر کدار نکلی۔ آگ بگولہ ہو گئے کہ اوہو اس بھر کدار گٹھڑی میں آپ کا لباس رکھا جاتا ہے۔ کپڑے تہ ہوتے ہیں۔ یہ اچکن بھی تہ ہوا رکھا ہے۔ غرض سب کپڑوں کو کھول کھول کر صحن میں پھینک دیا۔ جب متبعین کی یہ حالت ہے۔ تو مقتداؤں (حضرات صحابہ کرامؓ) کی حالت سے کیا تعجب۔ (دستور سہارن پور ص۴۱)

۲۱- فرمایا: ہمارے حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ پر ایسی تواضع کا خاص طور پر مذاق غالب تھا۔ ایک بار مولانا تھانہ بھون تشریف لائے اور آپ کا وعظ ہوا تو مولانا پائنتی بیٹھے تھے اور ہماری قوم شیخ زادہ کو دیکھئے کہ وہ مولانا کے سرہانے بیٹھے تھے۔ مولانا تو قوم کے بھی شیخ زادہ تھے۔ اگر مولانا سرہانے نہ بیٹھتے تو ان لوگوں کو یہ زیبا تھا کہ اس پلنگ کو خالی چھوڑ دیتے اور اس پر کوئی نہ بیٹھتا۔ مگر اللہ بچائے ایسی شیخ زادگی سے بھی کہ کسی کی تعظیم و تکریم نہ کریں۔ مولاناؒ کی یہ خاص شان تھی کہ ان کو اپنے سرہانے کسی کے بیٹھنے سے ذرا بھی ناگواری نہ ہوتی تھی وہ تو قصداً پائنتی کی طرف بیٹھتے تھے مگر بعض کا مذاق دوسرا ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ چھوٹوں کے ساتھ چھوٹوں کا سا معاملہ کرنا چاہیے۔ اس سے ان کا دل خوش ہوتا ہے۔ (تاسیس البنیان علی تقویٰ من اللہ و رضوان ص۲۸)

——(باقی آئندہ)——

جناب اختر راہی ۔ بی ۔ اے

ارباب نظر کا اتفاق ہے کہ سیاسی نظام کی کامیابی کا انحصار بڑی حد تک معاشی پالیسی پر ہوتا ہے۔ اگر معاشی پالیسی عدلِ اجتماعی اور عوامی فلاح و بہبود کے تقاضوں پر استوار ہو تو عوام کی زندگی میں راحت اور خوشحالی کا دور دورہ ہوتا ہے اور اگر حالات اس کے برعکس ہوں تو دنیا "جہنم" کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔

آج جو مادی نظام ہائے حیات رائج ہیں۔ ان کے "استحکام" کے باوجود انسانیت کو راحت و سکون حاصل نہیں ہے۔ سرمایہ داری ہو یا سوشلزم دونوں انسانیت کیلئے کوئی خدمت انجام نہ دے سکے بلکہ الٹا ان نظاموں نے انسان کو گوناگوں مسائل میں پھنسا دیا۔ نظریہ ظاہر ان دونوں نظام ہائے حیات میں تضاد و تباین دکھائی دیتا ہے۔ لیکن ذرا گہری نظر سے مطالعہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کی بنیادیں ایک ہی زمین پر قائم ہیں۔ دونوں انسان کی بے قید آزادی کے دعویدار ہیں اور زندگی کے مسائل حل کرنے میں "عقل" ہی کو حرفِ آخر سمجھتے ہیں۔ کسی "الہامی ہدایت" پر ان کا یقین نہیں۔ ان کے ہاں اگر مذہب کوئی حقیقت ہے تو وہ بس انسان اور خدا کا پرائیویٹ معاملہ ہے۔

ان مادی نظاموں کے برعکس "اسلام" ایک عالمگیر اور ہمہ گیر اصلاح کا پروگرام پیش کرتا ہے جو گذشتہ طویل مدت سے اپنوں کی کوتاہی اور غیروں کی سازشوں کی بناء پر عملی جامہ نہ پہن سکا۔ تاہم اس نظام نے عہدِ نبوت اور خلفائے راشدین کے چالیس سالہ عرصے میں دنیا کے سامنے ایک "قابلِ تقلید" مثال پیش کر دی۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس سنہری دور میں عرب کے اُمی اور شتربان زمانے کے امام بنے۔ اگر سند لی جاتی تھی تو ان کے قول

کی، اور اگر کہیں قوت وحشمت کا ذکر ہوتا تھا تو ان کا۔ یہ کرشمہ تھا اس عالمگیر پیغام اور نظام کا، جس کے وہ "اہل عرب" داعی تھے

اپنی ہی نہیں غیروں کی تاریخ شاہد ہے کہ چشم فلک نے ایسا دور اس سے پہلے نہیں دیکھا اور نہ اس کے بعد دیکھ سکی۔ قیصر و کسریٰ کے مادی نظاموں کی بنیادیں ہل گئیں۔ ان کے جلال و جبروت کے پرزے اڑ گئے۔ اور عربوں کی اخلاقی و معاشی برتری ایک مثال بن گئی۔

اندرون ملک ہر فرد کی بنیادی ضروریات۔ خوراک، پوشاک، رہائش، علاج اور تعلیم پوری ہو رہی تھیں۔ آج کی مروجہ اصطلاح میں کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی حکومت کا ہر شہری بیمہ شدہ (INSURED) تھا۔ اس مختصر آرٹیکل میں اسی مالی نظام کا خاکہ پیش کیا جاتا ہے جس نے زمانے بھر میں اپنی قسم کی واحد مثال پیش کر کے انسانیت کو امن و چین کا پیغام دیا۔

اسلامی حکومت کے مالی نظام میں مرکزی حیثیت "بیت المال" کو حاصل ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور سے لیکر خلفائے راشدین تک اس اجتماعی ادارے میں تبدیلیاں عمل میں آتی رہیں۔ عہد نبوت میں جو آمدنی حاصل ہوتی تھی۔ اُسے فوراً مصارف کے مطابق خرچ کر دیا جاتا تھا۔ اس وقت آمدنی محدود ہونے کی وجہ سے بمشکل اجتماعی معاملات انجام پاتے تھے۔ اس لئے آمدنی میں سے کوئی شے نہ بچتی تھی۔ جنگی ضرورتوں کو پورا کرنے کی خاطر ہنگامی چندوں سے کام لیا جاتا تھا۔ عہد صدیق رضؓ میں بھی یہی صورت حال رہی۔ ان کے دور میں خصوصاً نبیوں کی وجہ سے جو فتنہ ارتداد پیدا ہو گیا تھا اسی نے تمام توجہ جذب کر لی لہذا اجتماعی اداروں کیطرف کوئی خاص توجہ نہ دی جا سکی اور وہ اسی ڈگر پر کام کرتے رہے جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں چل رہے تھے۔ بیت المال کی آمدنی مصارف پر صرف کرنے کے بعد بمشکل ہی بچتی تھی۔ ایک روایت ہے کہ جب خلیفہ اول کا انتقال ہوا تو اس وقت ان کے پاس بیت المال کا صرف "ایک دینار" تھا۔ (السیاست الشرعیہ عبدالوہاب شرعیہ مصریہ اردو ترجمہ ص ۲۵۱)

خلیفہ دوم حضرت عمرؓ کے عہد میں اسلامی ریاست کی حدود وسیع ہوئیں اور ارض مصر و شام اور عراق کے علاقے ریاست اسلامی کی حدود میں شامل ہوئے تو محاصل میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ لہذا اس مال کی حفاظت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے ایک دیوان (دفتر) قائم کیا جس میں آمد و خرچ کا پورا ریکارڈ موجود رہتا تھا۔ اور ان لوگوں کی فہرست مرتب

کرائی جو وظائف کے مستحق تھے۔ اور ان کے وظائف کی تعیین کی گئی۔

بعض مورخین نے لکھا ہے۔ کہ حضرت عمرؓ نے دواوین (جمع دیوان) کا نظام ایرانیوں سے اخذ کیا اور ایک ایرانی سردار کے مشورے سے "بیت المال" کا اجتماعی ادارہ قائم کیا۔ "دیوان" فارسی الاصل لفظ ہے جس کے معنی سجل (سرکاری کاغذات) یا دفتر کے ہیں لیکن اصطلاحاً دیوان سے مراد وہ جگہ لی جاتی ہے جہاں مالی امور طے پاتے ہیں۔ عہد بنی امیہ میں باقاعدہ "دیوان الخراج" کا وجود ملتا ہے۔

بیت المال کے بارے میں اسلامی تصور | بیت المال خدا اور خلق کی ایک امانت ہے جس میں سے حق کے بغیر نہ کچھ لیا جاسکتا ہے اور نہ حق کے بغیر کچھ داخل ہی کیا جاسکتا ہے۔ اس میں فرما نرواؤں کی ذاتی اغراض کیلئے کچھ نہیں ہے۔ خلفائے راشدین کے طرزِ عمل سے اس پر روشنی پڑتی ہے۔

حضرت ابوبکرؓ صدیق جس روز خلافت کے منصب پر فائز ہوئے، اس کے اگلے دن کندھے پر کپڑے کے تھان رکھے فروخت کے لئے نکلے کیونکہ منصب خلافت پر متمکن ہونے سے پہلے ان کا یہی ذریعہ روزگار تھا۔ راستے میں حضرت عمرؓ سے ملاقات ہوئی۔ تو انہوں نے کہا آپ کیا کر رہے ہیں۔؟ جواب دیا۔ بچوں کا پیٹ پالنے کیلئے اس کے سوا کیا چارہ کار ہے۔؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا اب آپ کے کندھوں پر مسلمانوں کی سربراہی کا بوجھ آپڑا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بزازی نہیں چل سکتی۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوعبیدہؓ سے بات چیت کر کے حضرت ابوبکرؓ کے لئے وظیفہ مقرر کرا دیا جو تقریباً چار ہزار درہم سالانہ تھا۔ مگر جب ان کی وفات کا وقت قریب آیا تو انہوں نے وصیت کی کہ میرے ترکے میں سے آٹھ ہزار درہم بیت المال کو واپس کر دئے جائیں۔ یہ مال جب حضرت عمرؓ کے پاس لایا گیا تو انہوں نے کہا۔ "ابوبکرؓ پر خدا کی رحمت ہو انہوں نے بعد میں آنے والوں کو مشکل میں ڈال دیا ہے۔"

حضرت عمرؓ کا بیت المال کے بارے میں طرزِ عمل ان کے اس قول سے واضح ہے کہ:

"میں اس مال کے بارے میں تینوں باتوں کے سوا کسی کو جائز نہیں سمجھتا۔ حق کے ساتھ وصول کیا جائے۔ حق کے مطابق دیا جائے اور باطل کی آمیزش نہ ہونے دی جائے۔ میرا تعلق اس مال سے ویسا ہی ہے، جیسا یتیم کے

والی کا اس کے مال سے ہوتا ہے۔ اگر میں محتاج نہ ہوں تو اس سے کچھ نہ لوں گا
اور اگر محتاج ہوں تو معروف طریقے سے لوں گا۔ (کتاب الخراج ۔ ابو یوسف ص۱۱۷)

اسلامی ریاست آغاز ہی سے وفاقی (FEDERAL) طرز کی رہی ہے۔ صوبوں میں ولادت (گورنروں) کی حکومت ہوتی تھی جنہیں خلیفہ وقت کیطرف سے نامزد کیا جاتا تھا۔ اور ان کی ترقی و تنزل بھی خلیفۂ وقت کی مرضی پر منحصر ہوتا تھا۔ اس سے مراد یہ نہیں کہ عوام کو بالکل نظرانداز کر دیا جاتا تھا۔ بلکہ ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ خلیفۂ وقت اپنی رائے کے برعکس عوام کی منشار کے مطابق گورنروں کا عزل و نصب بھی عمل میں لاتے تھے۔ حضرت عمرؓ، حضرت عمار بن یاسرؓ کی جلالت شان کے باوجود انہیں والی (گورنر) کی حیثیت سے موزوں نہیں سمجھتے تھے تاہم انہیں عوام کے اصرار پر کوفہ کا گورنر نامزد کر دیا۔ البتہ بعد میں حضرت عمرؓ ہی کی رائے صائب نکلی اور ان کی جگہ سعد بن ابی وقاص کا تقرر عمل میں آیا۔

اس وفاقی نوعیت کے پیش نظر ہر صوبے کا مالی نظام قائم بالذات تھا۔ اور مرکز کو صوبوں سے حصہ رسدی دیا جاتا تھا۔ اس حصہ رسدی کی تعیین خلیفہ وقت اور شوریٰ کے فیصلہ سے ہوتی تھی۔ اب ذیل میں بیت المال کی آمدنی کے جملہ ذرائع پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

۱۔ خراج | انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مقالہ نگار نے لفظ خراج کو ارامی زبان کے لفظ CHOREGIA سے ماخوذ بتایا ہے۔ جو محصول کے معنوں میں مستعمل تھا۔ ایک دوسرے مؤلف ڈاکٹر اسے بن شمس نے اس کی اصل ارامی زبان کے لفظ HALAK کو قرار دیا ہے۔ جس کا مفہوم "محصول" آتا تھا۔ فقہائے اسلام نے بھی "خراج" کا لفظ انہی وسیع معنوں میں استعمال کیا ہے۔ (بحوالہ اسلام کا نظام محاصل ص۶۱) جس کے دائرے میں صفے، اموالِ غنیمت، محاصل جنگی اور جزیہ وغیرہ آ جاتے ہیں۔ اپنے مخصوص معنوں میں "خراج" کی اصطلاح غیر مسلم مالکان زمین کی پیداوار کے محصول کے لئے استعمال ہوتی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کے معاہدات میں "خراج" کا ذکر ملتا ہے۔ اہل تضاہ اور نصاریٰ نجران کے ساتھ معاہدات میں خراج متعین کیا گیا ہے۔ تاہم حضرت عمرؓ کے دور میں "خراج" ایک اہم مد آمدنی بنا۔

عہد فاروقیؓ میں حضرت سعد بن ابی وقاص کی سرکردگی میں عراق فتح ہوا تو سواد (عراق

کا ایک حصّہ) کی زمینوں کے بارے میں صحابہ کرامؓ کے درمیان اختلاف پیدا ہوا ایک گروہ کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ یہ زمین ان مجاہدین کے درمیان تقسیم کر دی جائیں جن کے زور بازو سے یہ علاقہ زیر ہوا ہے۔ اس گروہ کے سربراہ حضرت بلالؓ بن رباح تھے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف بھی یہی رائے رکھتے تھے۔

دوسرا گروہ اس کے برعکس یہ رائے رکھتا تھا کہ زمینیں مالک ذمیوں کے پاس ہی رہنی چاہئیں اور ان سے خراج وصول کیا جائے۔ اس فریق میں حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ شامل تھے۔

جب معاملے کی نزاکت نے طول کھینچا تو حضرت عمرؓ نے اوس اور خزرج کے پانچ پانچ سرکردہ افراد کو بلا کر مشورہ کیا اور ان کے سامنے صورتِ حال پیش کی۔ اپنی تقریر میں انہوں نے کہا:

"میں نے یہ رائے قائم کی ہے کہ زمینوں کو مع کاشتکاروں کے سرکاری ملکیت قرار دیدوں اور کاشت کاروں پر خراج عائد کردوں اور ان پر فی کس جزیہ عائد کردوں جسے وہ ادا کرتے رہیں۔ اس طرح یہ جزیہ اور خراج مسلمانوں کے لئے (ایک مستقل) فے کا کام کرے گا۔ جس میں فوجی، کم سن افراد اور بعد میں آنیوالی نسلیں حصّہ دار ہوں گی۔ ان سرحدوں کی حفاظت کیلئے بہرحال کچھ آدمی تعیناّت کرنے ہوں گے۔ جو مستقل طور پر وہاں رہیں، بڑے بڑے شہر جیسے شام، الجزیرہ، کوفہ، بصرہ، مصر۔ ان میں فوجی چھاؤنیاں قائم رکھنا اور سپاہیوں کو وظائف دیتے رہنا ناگزیر ہے۔ اب اگر یہ زمینیں اور ان پر محنت کرنیوالے کاشت کار تقسیم کر دئے جائیں گے تو ان لوگوں کو کہاں سے دیا جائے گا۔" (کتاب الخراج۔ فصل ۱۴۔ امام ابویوسفؒ)

حضرت عمرؓ کی اس وضاحت پر اوس و خزرج کے نمائندوں نے ان کا موقف مان لیا اور ذمیوں کی زمینوں پر خراج عائد کر دیا گیا۔

یہاں تک شرح خراج کا تعلق ہے۔ ان لوگوں کے لئے جو مقابلہ کرنے کی بجائے صلح کر لیتے ہیں۔ ان سے معاملہ شرائط صلح کے مطابق ہی ہوتا ہے تاہم ان پر خلیفۂ وقت خراج عائد کر سکتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل خیبر سے نصف پیداوار پر صلح کی تھی۔

(کتاب الخراج۔ فصل ۱۴ امام ابویوسفؒ)

اور حضرت عمرؓ نے گیہوں کی زمین سے چودہ درہم فی ایکڑ کے حساب سے خراج وصول کیا۔ حضرت عمرؓ نے سواد کی زمینوں کی پیمائش کرائی تو رقبہ تین کروڑ ساٹھ لاکھ جریب نکلا۔ حضرت عثمان بن حنیف درج ذیل شرح سے خراج عائد کیا۔

انگور کے باغات	۱۰	درہم	فی جریب
کھجور کے باغات	۸	"	"
بانس اور نرکل	۶	"	"
گیہوں	۴	"	"
جو	۲	"	"

دوسری روایت یہ ہے کہ مساحت سواد کے بعد حضرت عمرؓ نے فی جریب زمین پر ایک درہم نقد اور ایک قفیز غلہ عائد کیا۔ غلہ فوجوں کی خوراک کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ اس میں فصلوں کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ ماوردی نے اس کی توثیق کی ہے۔ (الاحکام السلطانیہ)

دونوں روایات کی تطبیق کی صورت یہ ہے کہ پہلے حضرت عمرؓ نے مروجہ شرح خراج کے مطابق ایک درہم فی جریب اور ایک قفیز مالیہ عائد کر دیا۔ بعد میں مغیرہؓ بن شعبہ نے ۲۲ھ میں لکھا کہ یہاں لوگ گندم اور جو کے علاوہ بھی فصلیں کاشت کرتے ہیں۔

(فتوح البلدان۔ البلاذری ص۱۸۲)

ڈینیل۔سی۔ڈینٹ (DANIEL-C-DANNETT) لکھتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے ضابطے کی بدولت کسانوں میں یہ رجحان پیدا ہو گیا تھا۔ انہوں نے غلے کے بجائے زمینوں میں قیمتی اشیاء کی کاشت شروع کر دی۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے نئی شرحیں نافذ کر دیں جن کا ذکر عثمان حنیف کے حوالے سے امام ابو یوسفؒ نے کیا ہے۔ (جزیہ اور اسلام ص۵)

۲۔ جزیہ: جزیہ سے مراد وہ رقم ہے جو غیر مسلم رعایا جان ومال اور عزت وآبرو کے تحفظ جیسے بنیادی حقوق سے استفادہ کرنے کے صلے میں اسلامی ریاست کو ادا کرتے ہیں۔ جزیہ کا لفظ "جزا" سے مشتق ہے اور لفظی مطلب "بدلہ" بنتا ہے۔

جزیہ کے لئے ایک دوسری اصطلاح "جالیہ" بھی مستعمل ہے۔ جسکی جمع جوالی آتی ہے۔ جالیہ کا لغوی مفہوم "گروہ" ہے۔ جن اہل عرب کو حضرت عمرؓ نے جزیرۃ العرب سے جلاوطن کیا تھا۔ ان کو "جالیہ" کہا جانے لگا۔ پھر یہ لفظ اس رقم کے لئے مخصوص ہو گیا۔

جو ان سے حاصل کی جاتی تھی رفتہ رفتہ ہر قسم کے جزیے کو یہی نام دے دیا گیا، چاہے جزیہ ادا کرنے والا کبھی بھی جلا وطن نہ ہوا ہو۔ (اسلام کا نظام محاصل ص ۱۰۶)

غیر مسلم رعایا اسلامی حکومت میں جملہ بنیادی حقوق سے استفادہ کرتے ہیں لیکن ملک کے دفاع و تحفظ کی ذمہ داری سے مستثنیٰ ہیں۔ مسلمان رعایا زکوٰۃ اور صدقات ادا کرتی ہے جن کا ایک حصہ قومی اثاثوں پر خرچ ہوتا ہے اور اسی سے جنگی سامان خریدا جاتا ہے۔ لیکن غیر مسلم رعایا سے یہ اسلامی صدقات وصول نہیں ہوتے اس لیے وہ اپنا حصہ رسدی "جزیہ" کی شکل میں ادا کرتے ہیں۔

متعصب مستشرقین نے یہ مغالطہ دینے کی کوشش کی ہے کہ جزیہ غیر مسلموں سے اس لیے وصول کیا جاتا ہے تاکہ انہیں ذلیل و رسوا کیا جائے۔ پروفیسر آرنلڈ نے PREACHING OF ISLAM میں اس بے بنیاد اور بے الزام کی حقیقت کھول دی ہے۔

حضرت ابو عبیدہؓ کا واقعہ مشہور ہے کہ انہوں نے اہل شام کو جزیہ کی رقم اس لئے واپس کر دی تھی کہ مسلمان رومیوں سے ان کی حفاظت کرنے کے قابل نہیں تھے۔

قرآن عزیز میں "جزیہ" سے متعلق :

"جنگ کرو اہل کتاب میں سے ان لوگوں سے جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہ لائے اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسول نے حرام کر دیا ہے۔ اُسے حرام نہیں کرتے دین حق کو اپنا دین نہیں بناتے۔ حتیٰ کہ وہ جزیہ دیں اور کمزور بن کر رہیں"

عثمان بن حنیف نے مندرجہ ذیل شرح سے اہل الذمہ سے جزیہ وصول کیا۔ امیر طبقے سے اڑتالیس ۴۸ درہم، متوسط طبقے سے چوبیس ۲۴ درہم اور غریبوں سے صرف بارہ ۱۲ درہم فی کس انہوں نے بچوں اور عورتوں کو جزیہ سے مستثنیٰ قرار دیدیا۔ اسی طرح حضرت عمرؓ نے ان لوگوں کو بھی جزیہ سے مستثنیٰ قرار دیدیا جو جزیہ ادا کرنے کے نا قابل تھے۔

جزیہ رقم کی بجائے مویشی، تجارت کے مال، گھر کے اسباب وغیرہ میں بھی ادا کیا جا سکتا ہے۔ البتہ سؤر، شراب اور مردہ جانور نہیں دیا جا سکتا۔

۲۔ زکوٰۃ جزیہ اور خراج غیر مسلم رعایا سے وصول کیا جاتا ہے اور مسلم رعایا زکوٰۃ اور عشر ادا کرتی ہے۔ زکوٰۃ اسلام کے معاشی نظام میں مرکزی اہمیت کی حامل ہے۔ قرآن مجید میں بیسوں جگہ صلوٰۃ و زکوٰۃ کا ذکر متصل آیا ہے، زکوٰۃ کے سلسلے میں آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے۔ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً (التوبہ : ۱۰۳)۔ (اے نبی)
آپ ان کے اموال میں سے صدقہ لے لیں۔

متذکرۃ الصدر آیت میں نبی اکرم کو مومنین کے اموال سے صدقہ لینے کا حکم دیا گیا ہے۔
اسلام کے اخلاقی اصولوں میں جہاں صلہ رحمی اور باہمی تعاون کی دوسری اقسام پر زور دیا گیا
ہے۔ وہیں "صدقات" کو بنیادی اہمیت دی ہے۔ صدقات سے مراد وہ اموال ہیں جو مومنین
اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے وقتاً فوقتاً دیتے رہتے ہیں۔ اس انفاق سبیل اللہ کے علاوہ
ریاست کیطرف سے ایک صدقہ بتاکید وصول کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ لہذا آیت متذکرہ
میں صدقہ سے مراد "زکوٰۃ" ہے۔

اسلامی ریاست کا مقصد وجود بیان کرتے ہوئے ایتائے زکوٰۃ کو ایک اہم فریضہ کہا
گیا ہے۔ الذین ان مکناھم فی الارض اقاموالصلوٰۃ واتوالزکوٰۃ وامروبالمعروف ونھو
عن المنکر۔ یہ (اہل ایمان) لوگ ہیں جنہیں ہم نے زمین میں اقتدار دیا تو یہ نماز قائم کریں گے۔
زکوٰۃ دیں گے۔ نیکی کا حکم دیں گے اور بدی سے روکیں گے۔ (الحج : ۴۱)

وعد اللہ الذین امنومنکم وعملو الصالحات لیستخلفنھم فی الارض —— واقیمو
الصلوٰۃ واتوالزکوٰۃ واطیعوالرسول لعلکم ترحمون۔ (النور : ۵۵-۶۵) ان لوگوں
سے اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے کہ انہیں زمین میں ضرور
خلافت دے گا —— اور نماز قائم کرو اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

اسلامی ریاست کے مقصدِ وجود کو بیان کرنے والی آیات میں واضح طور پر تاکید
کی ہے کہ زکوٰۃ اسلامی حکومت کے مالیاتی نظام کا ایک جزو ہے۔

قرآن نے صرف اصول دئے ہیں اور ان اصولوں کو نبی اکرمؐ نے عملی جامہ پہنایا ہے
اس لئے قرآن میں زکوٰۃ کی شرح متعین نہیں کی گئی۔ نبی اکرمؐ کی زندگی میں جب زکوٰۃ کا
نظام قائم ہوا تو جملہ اشیاء کے لئے نصاب زکوٰۃ متعین کر دیا گیا۔ زکوٰۃ کی جملہ تفاصیل صرف
بیان کر دینے پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ حیطۂ تحریر میں لائی گئی۔ آنحضرت نے محصلین زکوٰۃ
مقرر کئے۔ انہیں ہدایات جاری کیں۔ مختلف اشیاء کے لئے زکوٰۃ کی مندرجہ ذیل شرح
مقرر ہوئی۔

۱۔ سونے، چاندی اور زرِ نقد کی صورت میں جو دولت جمع ہو اس پر ڈھائی فیصد

سالانہ کے حساب سے زکوٰۃ وصول کی گئی۔ سونے اور چاندی کا نصاب مختلف ہے۔ ساڑھے باون تولے چاندی اور سات تولے سونے کی مقدار پہ زکوٰۃ وصول کی گئی۔ اس سے کم مقدار پہ زکوٰۃ نہیں لی گئی۔

۲۔ سونے، چاندی اور نقدی کے علاوہ تجارتی اموال اور مویشیوں پہ زکوٰۃ وصول کی گئی۔ بخاری کی کتاب الزکوٰۃ میں جانوروں کا نصاب اور شرح زکوٰۃ بیان کر دی گئی ہے۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے عامل بحرین حضرت انسؓ کو خط لکھا اور زکوٰۃ کا نصاب بتایا۔

ا۔ اونٹوں کے لئے زکوٰۃ کا نصاب پانچ اونٹ ہیں۔

ب۔ گائے اور بھینس کے لئے نصاب تیس کی تعداد ہے۔

ج۔ بھیڑ اور بکریوں کا نصاب چالیس کی تعداد۔

د۔ معدنیات اور زمینوں کے لئے بھی زکوٰۃ واجب ہے جبکہ یہ نجی اور انفرادی ملکیت میں ہوں۔ شرح زکوٰۃ بیس فیصد طے کی گئی۔

حضرت صدیق اکبرؓ کی خلافت میں قبائل طے، اسد، غطفان، اشجع اور بنو سلیم نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا۔ ان کی رائے تھی کہ نبی اکرم کی زندگی میں تو زکوٰۃ فرض تھی لیکن ان کی وفات کے بعد ضروری نہیں۔ لیکن حضرت صدیق اکبرؓ جیسے مرنجان مرنج اور رحیم شخص نے تلوار سونت لی اور منکرین زکوٰۃ سے آمادہ جہاد ہو گئے۔ حالانکہ حضرت عمرؓ نے حالات کی نزاکت کے پیش نظر سخت اقدام کی مخالفت کی تھی۔ لیکن حضرت صدیق اکبرؓ کیا مجاہدانہ اقدام کیا اور کہا:

"جو شخص نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرتا ہے۔ میں اس سے جہاد کروں گا۔"

چنانچہ انہوں نے اس فتنے کا قوت سے قلع قمع کیا۔

متجددین کی طرف سے آواز اٹھائی جاتی ہے کہ زکوٰۃ ایک ریاستی ٹیکس ہے اور اس میں کمی بیشی کا اختیار عوام کو حاصل ہے۔ لیکن زکوٰۃ محض ٹیکس ہی نہیں بلکہ عبادت ہے۔ نیز جدید دور کے ٹیکس سے بوجوہ مختلف ہے۔

اولاً موجودہ دور کے ٹیکس صرف آمدنی پر لگائے جاتے ہیں۔ زکوٰۃ مجموعی سرمائے پر ٹیکس ہے۔ ثانیاً زکوٰۃ کے مصارف نص قرآن سے متعین کر دیئے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ خرچ نہیں کی جا سکتی۔

۴۔ عشر | عشر سے مراد غلّہ کی وہ مقررہ مقدار ہے جو ایک مسلمان کی زرعی پیداوار سے حاصل کیا جاتا ہے۔ زمین کی نوعیت کے لحاظ سے عشر کی مقدار کم و بیش ہے۔ اگر زمین بارانی ہو یعنی پیداوار کا دار و مدار صرف بارش پر ہو تو زمین کی پیداوار کا صرف دسواں حصّہ (عشر) وصول کیا جاتا ہے اور اگر زمین چاہی ہو یعنی مصنوعی ذرائع آبپاشی سے فصل اگتی ہو تو پیداوار کا بیسواں حصّہ بیت المال میں جمع ہوتا ہے۔

اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ چاہی زمین پر انسانی محنت زیادہ ہوتی ہے جبکہ بارانی زمین پر انسانی محنت کم اور قدرتی حالات پر زیادہ انحصار کیا جاتا ہے۔

عشر کا حکم قرآنی نص سے ثابت ہے۔ "وآتوا حقہ یوم حصادہ" تم زمین کا حق اس (پیداوار) کے کٹ جانے کے وقت ادا کرو۔

امام ابو یوسف کی رائے کے مطابق ان اشیاء پر عشر عائد ہوتا ہے جو ذخیرہ کر کے رکھی جا سکتی ہیں۔ مثلاً گیہوں، چنا، چاول وغیرہ اور ایسی اشیاء جو جلد ضائع پذیر ہوں مثلاً سبزیاں اور خوشبودار پودے وغیرہ، ان اشیاء پر عشر نہیں ہے۔

عشر کا نصاب امام ابو یوسف نے پانچ وسق قرار دیا ہے۔ اگر ایک زمین ڈھائی وسق گیہوں اور ڈھائی وسق گندم دے تو اس پر بھی عشر واجب ہو جاتا ہے۔

اس کے برعکس امام ابو حنیفہ کے ہاں عشر و خراج ہر زمین سے لیا جاتا ہے۔ اس کے لئے کسی خاص مقدارِ پیداوار کا تعین نہیں کیا جاتا۔

۵۔ صدقات | زکوٰۃ کے علاوہ اسلام کے اخلاقی نظام میں انفاق فی سبیل اللہ کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح صدقات کی ترغیب دی گئی ہے۔ یاایھا الذین امنوا انفقوا مما رزقنٰکم ۲/۲۵۵۔ ترجمہ: مسلمانو! ہمارے دیئے ہوئے مالوں سے خرچ کرو — وانفقوا فی سبیل اللہ ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ ۲/۱۹۱ اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

صدقات مرکزی طور پر بیت المال میں جمع کئے جا سکتے ہیں اور بر وقت غرباء و مستحقین کی مدد کی جاتی ہے۔

۶۔ فے یا زرِ صلح | بعض اوقات کفّار مسلمانوں کی عسکری تیاری اور جاہ و جلال سے مبہوت ہو کر جنگ کئے بغیر ہی میدانِ جنگ سے بھاگ جاتے ہیں۔ میدانِ جنگ میں

ان کا چھوڑا ہوا مال "فے" کہلاتا ہے۔ اسی طرح اگر کفار لڑنے کی بجائے زر صلح دے کر مفاہمت کے خواستگار ہوں اور مسلمان اس رقم کے عوض صلح کر لیں تو یہ رقم بھی "فے" کے زمرے میں شامل ہوتی ہے۔

چونکہ "فے" کسی جہاد و قتال کے بغیر حاصل ہوتا ہے لہذا اسے بیت المال کا حق بتایا گیا ہے۔ اور مجاہدین و غانمین میں تقسیم نہیں ہوتا۔ قرآن مجید میں ہے:

"جو فے کا مال اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو عطا کیا ہے اور تم نے اس کے لئے اپنے گھوڑے اور اونٹ نہیں دوڑائے۔ مگر اللہ جس پر چاہتا ہے اپنے رسولوں کو غالب کر دیتا ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے سو ایسا مال جو اللہ اپنے رسول کو بطور فے عطا کرتا ہے، وہ اللہ اس کے رسول، اس کے اہل قرابت، یتامیٰ، مساکین اور مسافروں کا حق ہے۔ تاکہ وہ تمہارے مالداروں کے ہی درمیان گردش نہ کرتا رہے۔" (الحشر ۶-۷)

متذکرۃ الصدر آیات میں فے کے مصارف بیان کر دئیے گئے ہیں۔ اس مال کو مکمل طور پر بیت المال میں جمع کر دیا جاتا ہے اور ضرورت پر مستحقین میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اسی قانون الٰہی کے پیش نظر "فے" کے اموال مجاہدین میں تقسیم نہیں کئے گئے۔ حضرت عمرؓ کا طرز عمل اسی کے مطابق تھا۔

۷۔ **اموال غنیمت کا خمس** اسلام کا پیش کردہ تصور جہاد جدید دور کی جاہلانہ جنگوں سے مختلف ہے۔ مادی نظام ہائے حیات میں جنگ کے دوران بزور بازو حاصل ہونے والے اموال کو فاتح کا حق خیال کیا جاتا ہے اور مغربی قانون میں اسے SPOILS OF WAR کا نام دیا جاتا ہے۔

بعثت اسلام سے پہلے عربوں میں جو جنگ کا نظریہ رائج تھا۔ اس کا اندازہ لفظ "حرب" سے ہوتا ہے۔ "حرب" کے تصور میں لوٹ کھسوٹ اور غارتگری کا مفہوم بھی شامل ہے۔ عہد جاہلیت کا اصول تھا کہ جنگ کے دوران میں جو کچھ کسی نے لوٹ لیا وہ اسی کا حق ہے۔ اس لالچ اور خود غرضی کے پیش نظر لوگ بڑھ چڑھ کر جنگوں میں حصہ لیتے اور اموال غنیمت حاصل کرتے۔ امت مسلمہ کو ۲ھ میں پہلی جنگ کا سامنا کرنا پڑا اور بدر کی اس پہلی ٹکر میں مسلمان کامیاب و کامران ہوئے۔ کامیابی کے بعد اموال غنیمت کے مسئلے پر اختلاف

رائے پیدا ہوگیا۔ ایک گروہ جس نے اموالِ غنیمت سمیٹے تھے۔ عہدِ جاہلیت کے دستور کے مطابق اس رائے کا حامل تھا کہ غنیمت ہمارا ہی حق ہے۔ لیکن دوسرا گروہ جس نے اموالِ غنیمت کی بجائے کفار کا تعاقب کیا تھا۔ اس بات کا مدعی تھا کہ اگر ہم کفار کا تعاقب نہ کرتے تو فتح شکست میں بدل جاتی، لہذا اموالِ غنیمت میں ہمارا بھی حصہ ہے۔ ایک تیسرے فریق نے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کر رہا تھا اپنے دعاوی پیش کئے کہ درحقیقت جانثاری تو ہم نے دکھائی اور آقائے دوجہاں کے گرد حصار بن کر ڈٹے رہے۔ اگر ہم بھی لوٹ مار میں شریک ہوتے تو غنیمت کا مال سمیٹ لیتے۔

بات اختلافِ رائے سے بڑھ کر باہمی تلخی تک جا پہنچی تو اللہ تعالیٰ نے ہدایت فرمائی۔ "واعلموا انما غنمتم من شيء فان لله خمسه وللرسول ولذي القربیٰ واليتامیٰ والمساكين وابن السبيل ان كنتم آمنتم بالله وما انزلنا على عبدنا يوم الفرقان يوم التقى الجمعان والله على كل شيء قدير۔ (الانفال - ۴۱) ترجمہ: جان لیجئے جو کچھ تم نے مالِ غنیمت حاصل کیا ہے اس کا پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسول رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہے۔ اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو اور اس چیز پر جو فیصلے کے دن یعنی دونوں فوجوں کے مقابلے کے دن ہم نے اپنے بندے پر نازل کی تھی۔"

اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرامؓ کی رہنمائی اسطرح کی کہ نہ تو عہدِ جاہلیت کا قانون درست ہے اور نہ اپنی طرف سے کوئی رائے ہی قائم کرنے کی حاجت ہے۔ پانچواں حصہ اللہ، اس کے رسول، رسول کے رشتہ داروں، یتامیٰ، مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہے۔ یہ حصہ بیت المال میں شامل ہوگا۔ اور باقی چار حصے اموالِ غنیمت اس پوری فوج میں تقسیم ہوں گے جو لڑائی میں شریک ہوتی ہے۔

اموالِ غنیمت کی تقسیم کا یہ سلسلہ جاری رہا کہ جو مال بھی کفار میدانِ جنگ میں چھوڑ کر بھاگ جاتے اسے خلیفہ وقت کے حضور پیش کیا جاتا اور حکمِ ربانی کے مطابق تقسیم عمل میں آتی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اٹھ جانے کے بعد ان کا حصہ خاندانِ نبوت کے فقراء میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔

مالِ غنیمت کے چار حصے جو فوج میں تقسیم ہوتے رہے، اس کا طریقہ کار فقہاء نے یہ طے کیا ہے کہ ہر گھوڑ سوار کو تین حصے ملے اور پیادہ کو صرف ایک حصہ۔ گھوڑ سوار

کے تین حصوں میں دو حصے گھوڑے کے شامل ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بدری صحابہؓ میں غنائم اسی طرح تقسیم کئے۔

فقیہ اعظم امام ابوحنیفہؒ فرماتے تھے۔ "آدمی کے لئے ایک حصہ اور گھوڑے کے لئے ایک حصہ"۔ ان کے نقطۂ نظر کے مطابق جانور کو مسلمان مرد سے افضل نہیں قرار دیا جاسکتا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ:

"حضرت عمرؓ بن خطاب کے ایک عامل نے شام کے علاقے میں سوار کو ایک حصہ اور پیادہ کو ایک حصہ دیا۔ یہ بات حضرت عمرؓ کے سامنے پیش ہوئی تو آپ نے اسے جائز قرار دیا۔"

تاہم حضرت امام ابوحنیفہؒ کی رائے کے برعکس احادیث و آثار زیادہ ثقہ ہیں

۸۔ خمسِ معادن | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ہے: وفی الرکاز الخمس (بخاری کتاب الزکوٰۃ) یعنی رکاز میں خمس ہے۔ رکاز کے لغوی معنی "دفینہ" ہے۔ امام ابویوسفؒ نے ایک روایت میں آنحضرتؐ سے تفسیر ان الفاظ میں نقل کی ہے:

فقیل لہ ما الرکاز یا رسول اللہ؟	(نبی اکرم سے) دریافت کیا گیا کہ یا رسول اللہ رکاز سے کیا مراد ہے
فقال الذھب والفضۃ الذی	آپ نے فرمایا وہ سونا اور چاندی
خلق اللہ فی الارض یوم خلقت	جو اللہ تعالیٰ نے خلقی طور پر زمین
(کتاب الخراج ص۲۲)	کے اندر ودیعت کر دیا ہے۔

اسی طرح دیگر معدنیات سے بھی خمس لیا جاتا ہے، لیکن یہ خمس اس وقت وصول ہوتا ہے جب دھات خام حالت سے اخذ کی جاتی ہے۔

۹۔ وقف | جو اشیاء منقولہ و غیر منقولہ ذاتی ملکیت سے نکال کر رفاہِ عامہ کے کاموں کے لئے مختص کر دی جائیں۔ انہیں اصطلاحاً "وقف" کہا جاتا ہے۔ اوقات کی آمدنی بھی بیت المال کا حصہ تصور کی جاتی ہے۔

اسلام میں سب سے پہلے حضرت عمرؓ فاروق نے غیر منقولہ جائداد وقف کی۔ جب آیت: من ذی الذی یقرض اللہ قرضاً حسناً۔ نازل ہوئی تو حضرت طلحہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا۔ یا رسول اللہ میرا باغ جو مجھے بہت عزیز

ہے۔ اللہ کی راہ میں دیتا ہوں۔ آپ نے ارشاد فرمایا : اجعلہ فی فقراء قومك : تم اس کو اپنی قوم کے محتاجوں کے لئے وقف کر دو۔

۱۰۔ اموالِ فاضلہ | لاوارث شہریوں کا مال بیت المال کا جزو بن جاتا ہے اور اگر کوئی مسلم مرتد ہو کر دار الحرب قرار ہو جائے تو اس کا مال بھی ضبط ہو جاتا ہے۔

۱۱۔ عشور (محصولات) | ایران و روم کی سلطنتوں کا یہ دستور تھا جب کوئی مسلمان تاجر ان کے ملکوں میں تجارت کی غرض سے مال لے جاتا تھا تو وہ محصول لیا کرتے تھے۔ مگر جب ایرانی غیر مسلم خلافتِ اسلامیہ میں تجارتی مال لاتے تو ان سے کوئی ٹیکس وصول نہیں کیا جاتا تھا۔ اسطرح مسلمان تاجر خسارے میں رہتے تھے

حضرت عمرؓ نے اس کا حل نہ نکالا۔ عمّال کو اطلاع دی کہ تم اموالِ تجارت پر اسی طرح ٹیکس وصول کرو اور اسے بیت المال میں جمع رکھو۔

بیت المال کے مصارف

فقہاء نے بیت المال کو چار شعبوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے شعبے میں مالِ غنیمت، کنز اور رکاز کے خمس اور صدقات شامل ہیں۔ دوسرے شعبے کی مداتِ آمدنی، زکوٰۃ، عشر اور مسلمان تاجروں سے وصول کردہ ٹیکس ہے۔ تیسرے شعبے میں وہ اموال داخل کئے جاتے ہیں۔ جو غیر مسلم رعایا سے وصول ہوتے ہیں، یعنی خراج، جزیہ اور غیر مسلم تاجروں سے وصول کردہ ٹیکس چوتھے شعبے میں متفرق اموال جمع ہوتے ہیں۔ مثلاً ہنگامی چندہ، اموالِ فاضلہ وغیرہ شعبۂ اوّل کے مصارف "خمس" کے طور پر تقسیم ہوتے ہیں۔ قرآن حکیم اور سنتِ نبوی نے یہ مصارف متعین کر دئے۔ خمس کے مستحق رسول، اس کے رشتہ دار، یتامیٰ، مساکین اور مسافر ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ریاست کی سربراہی کا کوئی الاؤنس وغیرہ نہیں ملتا تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے فتوحات کے خمس میں سے ایک حصہ تجویز کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ خانوادۂ نبوت کی کفالت کی ذمہ داری نہایت ضروری ہے۔ اور اس وقت اسلامی ریاست کا نظامِ مالیات ابتدائی درجے کا تھا۔ چنانچہ فتوحات پر تو کچھ مل جاتا تھا لیکن پھر اللہ تعالیٰ کے در پر ہی نگاہ رہتی تھی۔

وظائف | خلافتِ راشدہ میں جب بیت المال کی آمدنی میں معتد بہ اضافہ ہوا تو

خانوادۂ رسول کے لئے وظائف مقرر کر دئے گئے۔

ازواج مطہرات کیلئے بارہ ہزار درہم فی کس سالانہ مقرر کئے گئے تھے۔ آنحضرتؐ کے چچا حضرت عباسؓ کو بھی بارہ ہزار درہم سالانہ کا وظیفہ ملتا تھا۔ اسامہؓ بن زیدؓ کا حصہ چار ہزار رہا اور حضرت عمرؓ نے اپنے بیٹے عبداللہ بن عمر کے لئے تین ہزار مقرر کیا۔ حسنینؓ کو پانچ ہزار درہم سالانہ وظیفہ ملتا تھا۔

مہاجرین و انصار کے لڑکوں کے لئے دو ہزار فی کس سالانہ تجویز کیا گیا۔ مکہ والوں اور عام لوگوں کا حصہ فی کس آٹھ سو درہم سالانہ مقرر ہوا۔

بچوں کے لئے ولادت کے ساتھ ہی سو درہم وظیفہ مقرر کر دیا جاتا تھا۔ بچے کے بڑھنے کے ساتھ وظیفہ دو سو کر دیا جاتا اور بالغ ہونے پر وظیفہ پورا ملنے لگتا۔

بیت المال کے دوسرے شعبے کے "مصارف ثمانیہ" مندرجہ ذیل آیت سے واضح ہیں، انما الصدقات للفقراء والمساکین والعاملین علیہا والمؤلفۃ قلوبہم وفی الرقاب والغارمین وفی سبیل اللہ وابن السبیل فریضۃ من اللہ۔ یعنی صدقات (زکوٰۃ) صرف غرباء، مسکینوں، وصول کرنے والوں کارکنوں اور مؤلفۃ القلوب کے لئے ہے۔ اور غلاموں کو آزاد کرانے کیلئے، قرضداروں کے قرض ادا کرنے میں۔ اللہ کے راستے میں اور مسافروں کے لئے ہے۔ یہ اللہ کیطرف سے مقرر ہے۔ (توبہ)

تیسرے شعبے کے مصارف وظائف حکومت کی انجام دہی میں خرچ ہوتے ہیں۔ اور چوتھے شعبے کے مصارف رفاہ عامہ (PUBLIC WORKS) کے کاموں پر خرچ ہوتے ہیں ——

زکوٰۃ و عشر کے علاوہ باقی محاصل میں مسلم و غیر مسلم میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ حضرت عمرؓ نے فقراء و مساکین میں غیر مسلموں کو بھی شامل کیا ہے۔ امام ابو یوسفؒ نے قانون فقہ میں اس قول کو سند قرار دیا ہے۔ جزوی تفصیلات خلیفۂ وقت اور مجلس شوریٰ حالات کے تقاضوں کے پیش نظر طے کرتی ہے۔ ■■

حضرت مولانا شاہ محمد یعقوب مجددی بھوپالیؒ

بنام مولوی غلام محمد بی اے کراچی

یعقوبی نامہائے مبارک

راقم عاصم نے اپنی تالیف تذکرۂ سلیمان میں حضرت شاہ محمد یعقوب مجددی بھوپالی نور اللہ مرقدہٗ کا ذکر مبارک بھی کیا ہے۔ (صفحہ ۵۳۹) اور اس سلسلہ میں یہ عبارت بھی موجود تھی،

"ہم (یعنی یہ عاجز اور حضرت سیدی مولانا سید سلیمان ندویؒ) نماز عصر پڑھ کر چلے مگر جب خانقاہ پہنچے تو ابھی پیر صاحب مسجد سے واپس تشریف نہیں لائے تھے۔ حضرت والاؒ نے فرمایا کہ یہ حضرات نماز عصر بہت تاخیر کر کے پڑھتے ہیں، چنانچہ مغرب میں شاید آدھ گھنٹہ باقی ہوگا۔ کہ پیر صاحب نماز عصر سے فارغ ہو کر تشریف لائے۔"

تذکرۂ سلیمان جب مؤلف حقیر کیطرف سے ہدیۃً حضرت شاہ یعقوبؒ کی خدمت میں پہنچا تو حضرت موصوف نے ایک طویل رسیدی الطاف نامہ سے نوازا اور اوپر کی نقل شدہ عبارت سے متعلق تصحیح بھی فرمادی۔ مگر اس میں یہ جو تحریر فرمایا کہ حضرات نقشبندیہ (بہ غلبۂ حنفیت) نماز عصر تاخیر سے نہیں پڑھتے تو اس پر اس ہیچمیرز نے قلم برداشتہ باوجود ذہنی پریشانی کے جو اپنی لڑکی سمیہ سلمہا کی شدید علالت کی وجہ سے لاحق تھی، تاخیر عصر پر کچھ دلائل پیش کیں اور یہ عرض کیا کہ اس اظہار سے احقر کا منشاء ابرار و اعتراض حاشا وکلا نہ تھا۔ بلکہ محض ایک واقعہ کا اظہار جو اپنی واقعیت پر دلائل بھی رکھتا ہے۔ رہا خود حضرت عالی مرتبتؒ کے ہاں تاخیر پر عمل نہ ہوتا تو اس پر پوری طرح معذرت کر لی اور اپنی لاعلمی کے اعتراف کے ساتھ۔ اس کے جواب میں حضرت شاہ صاحبؒ نے پھر جوابی شفقت نامہ تحریر فرمایا تھا۔ یہی دو نامہائے مبارک مختصر حواشی کے ساتھ پیش ہیں، انشاء اللہ قارئین کے لئے محض دلچسپی نہیں بلکہ فیض یابی کا سبب بنیں گے۔ کیونکہ حضرت موصوف بڑے عالی نسبت ولی اور شیخ کامل و مکمل تھے۔ قدس اللہ سرہ العزیز۔ مکتوبات کا لفظ لفظ فنائیت و تواضع

کا مستقل سبق ہے۔ کاش ہم ناکاروں کو یاد رہ جائے ـــــ (غلام محمد)

(۱)

محبت شعار والاصفات جناب مولوی غلام محمد صاحب زاد لطفہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ جناب والا کا تحفۂ نادرکل وصول ہوا۔ بہت اچھی خدمت آپ نے انجام پہنچائی ہے

نام نیک رفتگاں ضائع مکن تا بماند نام نیکت پائیدار

حالات سلف سے ہمیشہ خلف والوں کو رہبر ہوتی رہی۔ حضرت والاصفات مرحوم کو بیشک اس خانقاہ شریف سے خصوصیت حاصل تھی۔ اس عاصی کا بھی اس میں ذکر فرمایا گیا ہے امید قوی ہے کہ جن اچھی نظروں سے اپنی پاک باطنی سے آپ نے اس معصیت آلودہ کو ملاحظہ فرمایا ہے۔ دعا فرماویں کہ جناب باری تعالیٰ میرا چہرہ اس روز بھی بارونق فرمادے جس روز سفید چہرے کالے اور کالے چہرے سفید ہو جاویں گے۔ اللھم یوم تبیض وجوہ و تسود وجوہ۔

جناب حکیم سید ابو حبیب[۱] صاحبؒ تیس چالیس برس تک اس خانقاہ شریف سے خاص وابستگی اور عشق رکھتے تھے۔ "معارف مجددیہ" میں بھی یہاں کے آنے اور اپنے حالات میں حضرت مرحوم نے تحریر فرمائی تھی جو طبع نہ ہو سکی۔ حضرت والد صاحب (شاہ ابو احمد بھوپالی قدس سرہٗ) رحمۃ اللہ علیہ کے پاس علماء کا جمع و مرکز ہمیشہ رہا۔ ہر عالم نے حضرت کو دیکھ کر یہ فیصلہ فرمایا کہ اتباعِ شریعت حضرت سے زیادہ ہم نے کہیں نہیں دیکھی۔

حضرت کے انتقال کے بعد ممکنہ صورت میں خانقاہ شریف کے حالات کو اور اپنی زندگی کے درست کرنے میں کوشاں رہا۔ اب بھی اللہ کا احسان ہے۔ علماء مہربانی فرماتے اور تشریف لاتے ہیں[۳]۔ حضرت مولانا مکرم (علامہ سید سلیمان ندویؒ) جب تشریف لائے

---

[۱] حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ کے برادر بزرگ اور شاہ محمد یعقوبؒ کے والد ماجد قطب الارشاد شاہ ابو احمد بھوپالی قدس سرہٗ کے خلیفۂ مجاز [۲] طبع نہ ہو سکی اور کافی عرصہ بعد تقسیم ہند کے بعد مسودہ بھی کھو گیا [۳] خاصکر تقسیم ہند کے بعد تو علماء کا کثرت سے رجوع ہندوستان میں یا تو حضرت ممدوح کے طرف تھا یا حضرت شاہ وصی اللہ رحمۃ اللہ علیہ (خلیفۂ مجاز حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہٗ) کیطرف۔ افسوس کہ دونوں ہستیاں اٹھ گئیں۔

تھے تو مسجد میں مجھ کو اطلاع دی جاتی تھی کہ حضرت تشریف لائے ہیں. عصر کے بعد سے جناب مولانا عبدالرشید صاحب مسکین سے، مغرب تک درس لیا کرتے تھے، یہی سبب تاخیر سے آنیکا ہوا تھا[1] ہمارے یہاں جب کہ شریعت نبویہ کا خاص خیال رکھا جاتا ہے تو عصر کی کوتاہی اور دیر میں پڑھنا جسکی حدیث مبارک میں سخت وعید آئی ہے، کیونکہ ممکن ہے، پھر اس پر یہ ارشاد فرمایا جائے کہ اس طریق کے لوگ عصر کو آخر کر کے پڑھتے ہیں. انصاف سے بعید ہے[2]

الحمدللہ کتاب (تذکرۂ سلیمان) اچھی حالت میں پہنچی. اور بھی انشاءاللہ کتب مندرجۂ فہرست وقتاً فوقتاً فراہم کروں گا. بڑی ہی عظمت واحترام سے حضرت (علامہ سید سلیمان ندوی) کی کتابیں دیکھتا ہوں.

جناب مولانا مولوی اشفاق الرحمٰن صاحب[3] اور حضرت سید صاحب مکرم رحمۃ اللہ علیہ دونوں حضرات ہمارے قریب کی مسجد میں ہمارے ساتھ نماز عصر ادا فرماتے تھے. (یعنی جب کبھی خانقاہ تشریف لے گئے ہوں گے.)

جناب سید ابوالنظفر صاحب[4] مرحوم فرزند جناب سید ابوحبیب صاحبؒ خانقاہ میں سید ابوحبیب صاحبؒ کے انتقال کی ایک مدت بعد تشریف لائے. ان کی زیارت سے نہایت ہی خوشی و فرحت حاصل ہوئی تھی. صاحب موصوف کا چہرہ بالکل اپنے والد صاحب سے ملتا ہوا اور گفتگو کی طرز بالکل وہی تھی، چند روز یہاں قیام فرما کر مختلف موضوعات و مسائل پر گفتگو فرماتے رہتے تھے، تشریف لے جاتے وقت یہ فرمایا: "جس خوش اعتقادی کو لے کر آیا تھا اس سے کہیں زیادہ لیکر جا رہا ہوں" جب میرا سفر جوناگڑھ ہوا تو احمد آباد سے وہیں تشریف لاکر بیعت فرمائے اور مخلصانہ و محبتانہ طریقہ تاحیات برتتے رہے.

---

[1] جس کا ذکر تذکرہ سلیمان میں سرمضمون نقل شدہ عبارت کی صورت میں ہوا تھا جو خلاف واقعہ تھا. کتاب کے دوسرے ایڈیشن کے لئے تصحیح کر دی گئی ہے. [2] اس کے جواب میں بہ تمام ادب احقر چند معروضات اسناد کے حوالوں سے عرض کی تھیں جن کو حضرت نے پھر رد نہیں فرمایا. [3] کاندھلوی حضرت تھانویؒ کے خلیفہ اور استاد حدیث تھے. حضرت علامہؒ نے موصوف کو جامعہ احمدیہ بھوپال میں لیا تھا. کراچی آکر رحلت فرما گئے. [4] ندوی عالم و فاضل مشہور اہل قلم شاہ صاحب سے پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو گئے.

ان کی صاحبزادیوں کے خطوط اب بھی اسی طریق پر آتے ہیں۔

جناب مولوی سلمانؒ میاں صاحب سے ملاقات ہو تو عاجز کا سلام فرمادیں اور یہ فرمادیں کہ ہم ہمیشہ آپ کو یاد کرتے ہیں۔ آپ غالباً ہم کو بھول گئے ہیں۔

اس خط میں بہت کم حالات لکھتا ہوں۔ سید ابوحبیب صاحبؒ اور ہمارے حضرت صاحب (شاہ ابو احمد) رحمۃ اللہ علیہ کے مابین بہت حالات رہے ہیں جنکو معارفِ مجددیہ میں ان کو اپنے قلم سے تحریر فرمایا ہے۔ ان تمام حالات میں اتباعِ سنت کا ذکر ہر جگہ ہے۔ ہمارے یہاں کے حضرات کبھی تعریفوں کے خواہاں نہیں رہے، یہ ایک انصاف کا فیصلہ تھا جو لکھا گیا ورنہ چنداں اسکی بھی ضرورت نہ تھی۔ فقط۔

محمد یعقوب مجددی۔ ۲۲ر ربیع الاول ۱۳۸۰ھ

(۲)

عالی صفات والاتبار جناب مولوی غلام محمد صاحب زاد لطفہٗ۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ خدا کرے کہ صاحبزادی سلمہا کا مزاج اب درست ہوگیا ہو۔ بہ تعمیلِ تحریرِ آنجناب دعا کر رہا ہوں کہ خدا ان کو عافیتِ تام عطا فرما کر ماں باپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک کا موجب قرار فرمادے۔ سابقہ خط میں جو لکھا تھا وہ ایک حقیقت تھی جسکو ظاہر کرنا اپنے خیال میں ضروری سمجھا تھا، اس کا کوئی برا اثر دل پر نہ اب ہے نہ رہے گا۔ آپ مطمئن رہیں اور حضرتِ مکرم مغفور (علامہ سید سلیمان ندویؒ) کی جو بھی تصنیف ہو اس سے مطلع فرمائیں۔ میں ان کی تصنیفات کو بہت محبت واحترام سے دیکھتا اور رکھتا ہوں۔

خدا کرے کہ ایسا موقع نصیب ہو کہ آپ سے ملاقات بھی ہو۔ (یہاں تو دوبارہ نہ ہو سکی انشاء اللہ بزرگوں کے دامن سے وابستگی کی طفیل اب جنت ہی میں رہے گی۔ کہ المرء مع من احب۔ ﷺ) آپ بھی مہربانی فرما کر مجھے بھی دعاؤں میں یاد رکھیں۔

راقم۔ محمد یعقوب مجددی از خانقاہ شریف مجددیہ بھوپال۔

۱؎ حضرت علامہ سید سلیمانؒ کے فرزند جنکو بھوپال میں حضرت نے گویا شاہ صاحبؒ کی باطنی توجہات کے سپرد فرمایا تھا۔　۲؎ افسوس کہ قدر نہ فرمائی۔
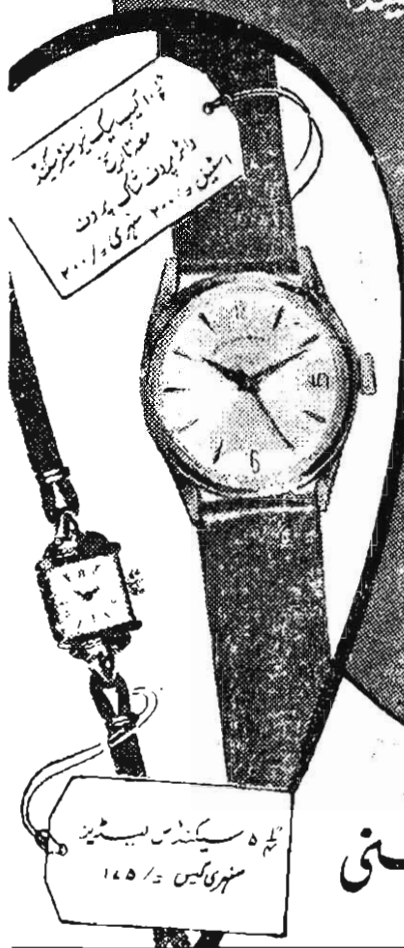
ویسٹ اینڈ واچ کمپنی
(سوئٹزرلینڈ)
کی
اعلیٰ معیاری
گھڑیاں
اب
نئے نئے
خوشنما ڈیزائنوں
میں
ہر جگہ دستیاب ہیں
مع تاریخ
واٹر پروف شاک پروف
سیکنڈس لیڈیز
سنہری کیس ۔/۱۲۵
واحد تقسیم کنندگان
کامریڈ واچ کمپنی
کراچی ۔ ڈھاکہ
NATIONAL 909 E

KBGD—L NO. 7681

ستمبر ۱۹۷۰

اعلیٰ بناوٹ

دل کش وضع

دل فریب رنگ

کا

حسین امتزاج

دنیا کے مشہور

SANFORISED

REGISTERED TRADE MARK

سینفورائزڈ پارچہ جات

سکڑنے سے محفوظ

ٹیلیفون

۲۳۸۱۵۰ ، ۲۲۳۹۳

۲۲۵۵۳۹

ستارہ چیمبرز

۲۹ — ویسٹ وارف کراچی

تار کا پتہ

آباد ملز